۷۸۶

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون

حالاتِ قدسی

مرتبہ

حسین خاں، بی، اے، ایل، ایل، بی

(الہ آباد)

حیدرآباد بک ڈپو، حیدرآباد دکن

عنوانات

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

احساس مذہب کی حرمت، جب لوگوں کے دلوں سے زائل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ تو پیرواں ملت میں مذہبی اختلافات رونما ہونے لگتے ہیں، اور تقریباً ہر جماعت ایک نئے عقیدہ کی موجد ہو جاتی ہے، حتےٰ کہ ہر فروعی اختلاف ایک اصولی بنجاتا ہے اور اس طرح شیرازۂ مذہب جدید عقائد کے اختراع سے منتشر کردیا جاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر گروہ ایک نیا مذہب ایک نیا دین، لیکر پیدا ہوا ہے، اس وقت مذہبی عروج وارتقا کا آفتاب لب بام نظر آنے لگتا ہے۔

مذاہب عالم کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ وہ زمانہ جس میں لوگوں کی مذہبیت، فرائض مذہب کو عملاً وفعلاً بجالانے کے بجائے، مباحث مذہبیہ اور مسائل متنازعہ فیہ کی تحقیق وتدقیق میں پڑ جاتی ہے جس کا مقصود بجز نام و نمود کے اور کچھ نہیں ہوتا، مذہب کے لیے انحطاط و زوال کا سبب بنجاتی ہے، کیونکہ یہ زمانہ، وہ زمانہ ہوتا ہے جبکہ احکام مذہب سے اعتنا نہیں برتا جاتا اور نہ مذہبی فرائض کے اتمام میں، وہ پہلا سا ایمان ویقین کا جوش و خروش رہتا ہے، اُس وقت تمام لوگوں کا جذبۂ دینی دل سے نکلکر صرف زبان پر آجاتا ہے، افراد کے دل و دماغ سے نقوش مذہبی مٹنا شروع ہو جاتے ہیں اور صرف زبانی مدعیان مذہب، جن کو اوامر ونواہی سے کوئی واسطہ نہیں رہتا، پیدا ہو جاتے ہیں۔

انحطاط مذہبی کے ان اسباب وعلل پر غور کرنے کے بعد، ہم اسلام

کی موجودہ حالت پر ایک عمیق نظر ڈالیں گے۔ اسلام جو تمام عالم کے لیے ایک رحمت بنکر آیا تھا، جس کے احکام جس کی تعلیم، جس کی تلقین، انسانی فطرت کے بالکل مطابق تھی، اور جو عہد سعادت سے لیکر زمانہ خلافت تک اپنی ہمہ دانی و ہمہ گیری کا ڈنکا بجوا چکا ہے، "کیا آج معترضین کے چند لچر اور پوچ اعتراضات سے اپنے اوصاف خصوصی میں کسی قسم کی کمزوری محسوس کر سکتا ہے، کیا اسلام کی حقانیت پر کبھی بھی پردہ ڈالا جا سکتا ہے" بالیقین یہ باتیں کبھی وہم میں بھی نہیں گذرتیں۔

ہاں اسلام کو اگر کسی بات نے نقصان پہونچایا تو وہ متبعان اسلام کے اختلافات عقائد، نزاع مسائل مذہبی نے۔ کیونکہ کسی مذہب کے لئے ان اختلافات کے رونما ہونے کا وہی زمانہ ہوتا ہے۔ جس میں پیروان مذہب، ادائیگی فرائض اور احکام مذہب کو چھوڑ کر مجتہد العصر بننا چاہتے ہیں، جن کا اجتہاد، نزاع باہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اسلام کا حقیقی منشا اور نصب العین کیا تھا "تعارف وحدانیت و رسالت کے بعد اُس قانون ابدی کو پیش کرنا جس پر عمل پیرا ہونے کے بعد تقاضائے فطرت اور مطالبات دین و ایمان، دو جداگانہ چیزیں نہ رہیں، یعنی وہ مکمل ترین نظام اصلاح انسانیت، جو تہذیب اخلاق، سیاستِ مدن، اور تدبیرِ منزل کے تمامی شعبوں پر حاوی ہو۔

یہ تھے اسلام کے وہ زرین اصول، جن کو سمجھ لینے اور جن پر کاربند ہونے کے بعد، ایک انسان اپنی انسانیت پر ایک قوم اپنی قومیت پر اور ایک مذہب اپنی مذہبیت پر، بجا طور پر فخر و ناز کر سکتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "ان الدین عند اللہ الاسلام" "الیوم اکملت لکم دینکم الخ" لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی کہ انھوں نے اپنے فرائض مذہب ہی کو نہیں چھوڑا، بلکہ اپنے نصب العین ہی کو بھلا دیا، وہ مذہب جو دنیا اور دنیا والوں کے لیے یہ پیام رحمت لیکر آیا تھا کہ۔ بلیٰ من اسلم

وجہٗ وہو مومنٌ فلہٗ اجرُہٗ عند ربہ۔

بہرحال یہ بات ظاہر ہے کہ مذہب اسلام کی حقانیت اور جامعیت، پیروان مذہب کی غلط کاریوں سے ملوث نہیں ہو سکتی، لیکن پیروان مذہب کے لیے یہ بات انتہائی شرمناک ہے کہ وہ مسلم اور مومن جیسے معزز و متبرک لقب سے ملقب ہونے کے بعد خود کو غیر مذاہب کی نظروں میں، اپنی مذہب فروشیوں کی وجہ سے، مطعون کریں اور اپنے متبرک مذہب کے نام پر بٹہ لگائیں

اسلام صرف چند فرائض و سنن، اور عبادات کے مجموعہ کا نام نہیں ہے، بلکہ اسلام عبارت ہے اس مذہب سے جو حیات نفسی اور حیات اجتماعی کے تمام اصول و قوانین مرتب کرنے کے علاوہ، روحانیت کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ وہ تعلیم روحانیت جو اسلام نے دی ہے کسی مذہب اور کسی ملت میں نہیں پائی جاتی، چنانچہ روحانیت اسلام کے مناظر اب تک مظاہر فطرت میں حیرت انگیز طریقوں سے رونما ہوتے رہتے ہیں۔

روحانیت کی اولین تاریخ مرتب کرنا آسان امر نہیں نہ ہمارے مقصد کے لئے وہ کوئی مفید چیز ہو سکتی ہے، بہرحال زمانہ سلف میں حکما کا گروہ جو اشراقین کہلاتا تھا، وہ روحانئین میں سے تھا، مثلاً افلاطون الٰہی اور سقراط زاہد وغیرہ اس گروہ کی روحانیت کو اسلامی روحانیت سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لئے ان کی روحانیت سے ہم اس جگہ بحث نہیں کریں گے۔

بحث روحانیت اسلام سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اُس کے تصوف کا مطالعہ کریں۔ اسلامی تصوف، اسلام سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ تصوف اسلامیہ عین اسلام ہے، اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ علوم اسلامیہ تین قسم کے ہیں علم شریعت، علم طریقت، علم حقیقت۔

علم شریعت کا موضوع، قرآن و حدیث ہے، علم طریقت کا موضوع عرفان خداوندی اور وصول الی اللہ ہے اور علم حقیقت کا موضوع ذات باری ہے، جو بے انتہا دقیق و نازک مسئلہ ہے اور جس کا علم، سوائے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کو نہ تھا اور نہ ہوگا، اس لیے کہ "سُبحٰنَکَ لاعِلْمَ لَنَا اِلّاَ مَاعَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ"۔ چنانچہ تصوف حقیقتاً، علم طریقت کا اصطلاحی نام ہے۔

کہا جاتا ہے کہ علم تصوف کے اکثر اصول دوسرے مذاہب سے ماخوذ ہیں یہ قول گو کسی حد تک صحیح ہے لیکن کلیتاً اس کا اطلاق، ایک الزام ہے جو تصوف اسلام پر عائد کیا جاتا ہے، اس لیے کہ تصوف کا اصل مبدا صرف اسلام ہے۔

ماہیت و غایت تصوف بیان کرنے سے پہلے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو صاف کر لیا جائے، جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے کہ شریعت اور طریقت دو جداگانہ چیزیں ہیں۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ طریقت، شریعت سے اور شریعت، طریقت سے کس طرح جدا کیجا سکتی ہے، اس لئے کہ شریعت نام ہے علم الیقین اور تزکیۂ ظاہر کا اور طریقت عین الیقین و تزکیۂ باطن سے عبارت ہے، بہ اعتبار مراتب و مدارج دونوں میں فرق سہی لیکن اصلیت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں، علم طریقت کا بغیر علم شریعت کے حاصل ہونا محال و ناممکن ہے، اس لیے کہ تزکیۂ باطن بغیر تزکیۂ ظاہر کے کسی طرح نہیں ہوسکتا۔ صفائے نفس گو دونوں حالتوں میں ضروری ہے، مگر ذوق طلب اور شوق تجسس بغیر لذت ریاضت اور لطف عبادت کے ناممکن ہے، تلاش خداوندی کے اگرچہ اور طریق بھی ہو سکتے ہیں، لیکن سب کے سب خطرات سے پُر اور مہالک سے مملو ہیں، شریعت اور طریقت کا انضمام لطیف ہی وہ ترکیب ہے جو ہر طرح محفوظ اور منازل عرفان تک پہونچانے والی ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ علوم ظاہری

اور علوم باطنی ایک دوسرے سے ملحق اور متعلق ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ جاہل کبھی درجۂ ولایت پر فائز نہیں ہو سکتا۔

حضور اکرم کا ارشاد ہے :- "ما اتخذ اللہ ولیاً جاھلاً قط" اور دوسری جگہ فرمایا ہے۔ "قصم ظھری رجلان جاہلٌ متنسکٌ وعالم متھتکٌ"۔

اس مسئلہ کے صاف کرنے کے بعد ہم پھر اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں، اسلام کی ترقی اور احیاء کلمۃ اللہ میں جو معاونت، اسلامی روحانیت اور علم تصوف کے علمبرداروں نے کی ہے، وہ بے نیاز توصیف ہے۔ اگرچہ ابتدائی زمانے سے لیکر آج تک تصوف کی تعلیم بعض مصالح کیوجہ سے علانیہ اور عام طریقہ سے نہیں ہو سکی، جس کی وجہ یہ ہے کہ علم تصوف یا علم طریقت و روحانیت کے حصول کی استعداد ہر شخص میں نہیں ہوتی، دوسرے سب سے بڑی شرط جو اکتساب علم روحانیت کے لیے ضروری ہے وہ علوم شرعیہ پر تبحر کامل ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ دونو باتیں شاذ و نادر مجتمع ہوتی ہیں۔

اسی لئے تصوف ہمیشہ ایک محدود طبقہ کے واسطے مخصوص رہا، اگرچہ تمام عالم کو اپنے تصرفات باطینہ سے مستفید بناتا رہا۔

مسائل تصوف اکثر ایسے ہیں کہ اگر وہ عام مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیئے جائیں تو جہلا کی ضلالت و گمراہی کا اندیشہ ہے اور اسی وجہ سے کوتاہ بین نظریں شریعت اور طریقت کو ایکدوسرے سے الگ سمجھتی ہیں، حالانکہ یہ صرف عقل و علم کا پھیر ہے ورنہ بات وہی ایک ہی، علمائے شریعت اور کاملین طریقت میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ جس چیز کو جانتے ہیں، یہ اُس چیز کو دیکھتے ہیں، اور یہ جس چیز کو دیکھتے ہیں، وہ اُس چیز کو جانتے ہیں۔ ہماری رائے میں تصوف کا صحیح مقصد، اپنی ذات سے باخبر ہونے کے بعد، بے خبر ہو جاتا ہے، اس لیے کہ عارف

جب اپنے وجود پر غور کرتا ہے تو اسے دو اجزا سے مرکب پاتا ہے، روح اور مادہ، یعنی ایک جوہر ہے اور دوسرا عرض، ایک فانی ہے اور دوسرا غیر فانی، اور غیر فانی چیز خدا، یا خدا کی ذات وصفات سے متعلق ہی کوئی چیز ہو سکتی ہے، اب روح کو "قل الروح من امر ربی"، کہہ لیجئے یا خالق ومخلوق کا ایک رشتۂ ازلی، روح ہی عبد ومعبود کے درمیان ایک ابدی واسطہ ہے۔

مادیات کی قید سے آزاد ہو کر، جب عارف یا سالک خود میں کچھ ڈھونڈتا ہے، کیونکہ اُس وقت اُسے یہ تلاش ہوتی ہے کہ "میں کیا ہوں"، تو روح اُس متجسس کو خود اُسی کی زبان سے جواب دیتی ہے کہ "جو میں ہوں وہی تو ہے" اور اُسی کے ساتھ یہ من وتو کا پردہ خود بخود اُٹھ جاتا ہے اور سائل ومجیب، وہ ایک ہی ذات ہوتی ہے۔ یہیں سے تجلیات ربانی کی ابتدا ہوتی ہے اور انسان خود کو ایک نورِ مجسم خیال کرنے لگتا ہے، حجابات مادی اُٹھ جاتے ہیں اور تحیر کی ایک کیفیت قلب پر طاری ہو جاتی ہے، مرتبۂ تحیر پر پہونچنے کے بعد ایک استغراقی کیفیت میں انسان ڈوب جاتا ہے اور حجابات نورانی پیش نظر ہو جاتے ہیں، اب اگر توفیق ایزدی نے مساعدت فرمائی تو عارف کے قدم مستانہ وار آگے پڑتے ہیں اور وہ ہر ہر حجاب نورانی کے اُٹھانے میں، سیکڑوں سجدے صرف کر دیتا ہے، ہزاروں عبادتیں نثار کر دیتا ہے، لاکھوں ریاضتیں قربان گاہ جلال پر چڑھا دیتا ہے، اس عالم بے خودی اور مدہوشی میں اگر اس خراب آباد عالم پر نظر پڑ جاتی ہے تو کچھ اور ہی دکھائی دیتا ہے، کائنات کا ہر ذرہ مصروف عبادت نظر آتا ہے اور دنیا کی ہر شے سر بسجود دکھائی دیتی ہے، ایک عرصہ تک یہ استعجابی کیفیت طاری رہتی ہے کہ یک بیک ذوق تجسس، شوق تلاش مجسم نظر پڑتا ہے، اور طالب بے تابانہ اُس کا پیچھا کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ پہلے والے مقام پر پہونچکر،

حجابات نوری میں غائب ہو جاتا ہی، بہرکیف، بقدر ذوق سعی، طالب مدارج عرفان طے کرتا رہتا ہے اور اکتساب معرفت کرتا جاتا ہی، اور یہی ہے معرفت کشفی وشہودی کی اصل وحقیقت،۔

اس حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد، طالب یا سالک اپنے قلب میں ایک ایسی کیفیت محسوس کرتا ہے، جس کا ہر لحظہ یہ تقاضا ہوتا ہی کہ کسی طرح روح اس کشمکش مادی سے چھوٹ جائے، اور فنائیت ذات کے وہ تمام مقام طے ہو جائیں، جہاں صرف وصال ہی وصال ہے۔ یہ تو سالک کی کیفیات باطنی اور واردات قلبی کا ایک مختصر سا بیان تھا جس کی وضاحت نہ صرف محال بلکہ ناممکن بھی ہی، اب ہم سلوک کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں:۔

سلوک نام ہے، تعمیر الظاہر والباطن کا یعنی اعضائے ظاہری اور باطنی کا ایک ساتھ طاعت خداوندی میں مشغول رہنا، لیکن بہ اتباع سنت نبویہ، اس لئے کہ حضور اکرم ظاہر و باطن ہر دو اعتبار سے، اعدل الخلق تھے پس آپ کے جملہ اعمال و افعال وہ کامل اعتدال لئے ہوئے تھے جس کی تقلید ہر متنفس کے قلب کو معتدل بنا سکتی ہی اور چونکہ قلب کو اعضا کے ساتھ تعلق قریبہ حاصل ہی، اس لئے یہ اتباع سنت، اس کے اعضا میں اعتدال پیدا کر دیتی ہے اور اُس کے افعال سے افراط و تفریط کی خطرناک ضلالت دور ہو جاتی ہے، جس کا اثر قلب پر پڑتا ہی، یہاں تک کہ قلب رذائل اخلاق سے متنفر ہو کر، خصائل حمیدہ سے متصف ہو کے معتدل بنجاتا ہے، قلب کے اس اعتدال کا نام نسبت ہے۔

جس وقت قلب میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے، اُس وقت طاعات میں لذت آنے لگتی ہے اور معاصی سے نفرت ہو جاتی ہی، عبادات، بالطبع محبوب و مرغوب بنجاتی ہیں، حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف، ہر امر کا ارتکاب گراں اور ناگوار گزرنے

لگتا ہے، اللہ کے ذکر و فکر سے اس درجہ اُنس حاصل ہوتا ہے کہ ایک لمحہ اُس کا چھوٹنا انتہائی اذیت کا باعث بنجاتا ہے۔ یہاں تک کہ قلب کو مغیبات میں مزا آنے لگتا ہے۔ تصوف اسلام کی یہ مجمل ماہیت بتانے کے بعد، اب ہم سب سے ضروری اور اہم بات یہ کہنا چاہتے ہیں کہ گروہ صوفیا کسی خاص فرقے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ بھی عامۃ المسلمین کی طرح ہیں، اُن کے طریقہائے عبادت وعقائد اسلام کی عام تعلیم سے جدا گانہ نہیں اور اُنہیں بھی وہی فرائض انجام دینا پڑتے ہیں، جس سے عام مسلمان مکلف کئے گئے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اُن کی عبادات میں رغبت ہوتی ہے، لذت ہوتی ہے، اور مقامات عرفان کی طرف ارتقائے روحانی، اُن کا ایک مقصد معین ہوتا ہے، جس کے حصول میں اُن کا قلب، اُن کی روح، ہر وقت سرگرم طلب رہتی ہے، وہ قلب کو عبادات ظاہری اور تکمیل فرائض دینوی کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور اُن کی روح فضائے لاہوت میں ہر وقت اپنے مقصد کا طواف کرتی رہتی ہے۔

جس محترم ہستی کے حالات وسوانح اس وقت پیش نظر ہیں، وہ اپنے کمالات باطنی، اور عبادات ظاہری سے مزین، اس عالم ناسوتی کے سامنے اُس درس ہدایت اور اُس سبق معرفت کو دُہرا رہی ہے جو اب سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے دُنیا کے سامنے پیش ہو چکا ہے۔

حضرت اقدس حقیقتاً مُلہم بالغیب اور موٗید من اللہ ہیں ہاتف غیبی آپ کی زبان سے بولتا ہے اور آپ جو کچھ کہتے ہیں اُستاد ازل کے حکم سے،۔

مرتب تذکرہ، جناب اقبال نے اگرچہ بعض مجبوریوں اور چند مصلحتوں کی وجہ سے کتاب ہذا میں اختصار کا التزام کیا ہے، لیکن چشم حقیقت نگر کے لیے اس اختصار میں بھی صدہا تفصیلات وتشریحات موجود ہیں۔

حضرت اقدس کا مقصد حیات، عامۃ الناس میں اُس جذبہ دینی کی روح پھونکنا

ہے، جس سے استقامت عمل جیسی نادر صفت پیدا ہو سکے، مذہب کی عظمت کا سکہ دلوں پر بیٹھ جائے اور احکام دینی کی پابندی ہر متنفس کا شعار بنجائے۔

آپ کی تعلیمات و ہدایات کا اگرچہ اس تذکرہ میں کوئی مستقل عنوان نہیں ہے، لیکن پھر بھی کہیں کہیں، ان کا ذکر آگیا ہے اور یہ وہ قابل قدر گنجینۂ حکمت و موعظت ہے جو مسائل مذہبی اور معاملات دُنیوی دونوں پر مشتمل ہے۔ مبارک ہیں وہ وجود مسعود جو لوگوں کی حاجات دینی و ضروریات دنیوی میں کفیل ہوں۔

آپ میں وہ تمام اوصاف نمایاں ہیں جن کی ایک مُصلح خلق ہستی کے لیے انتہائی ضرورت ہے۔

آپ کا مسلک وہ مسلک ہے جہاں امتیازات و اعتبارات دنیوی کی طمع کاریاں مفقود ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی آپ اپنی وسیع الاخلاقی اور دلجوئی سے جو آپ کا فطری شیوہ ہے ایک عالم کے قلوب کو مُسخر کر چکے ہیں، اور آپ کے اخلاق کی یہ دل آویزیاں ہر دیکھنے والے کے لئے سعی اخلاق حسنہ کا سبب بن گئی ہیں۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص فکر میں گزر رہا ہے اور گویا آپ کسی منصب عظیم کے متعلقہ افکار میں ڈوبے ہوئے ہیں، صاف ظاہر ہے کہ ایک قدسی صفات ذات جو مادیات سے پاک ہے کس طرح دنیوی افکار سے دوچار ہو سکتی ہے، بجز اس کے کہ بندگان خدا کی اصلاح عمل اور تہذیب اخلاق کی فکر میں ہو۔

آپ کی خصوصیاتِ حیات پر تبصرہ کرنا، میرے امکان سے باہر ہے، لیکن میں یہ ضرور کہونگا کہ وہ دن بہت قریب ہیں جبکہ آپ کے کمالات باطینہ، تمام دنیا پر آفتاب کی طرح چمکیں گے اور کائنات کے ذرہ، ذرہ کو منور بنا دیں گے۔

تصوف، وہ تصوف، جس پر مغرب نے، مغرب کے مقلدین نے صدہا لغو

اعتراضات کر ڈالے ہیں، اب اپنا چہرۂ نورانی افق مشرق سے دکھانیوالا ہے،
جس سے معترضین کے سینے یا تو تاریکی مادیت سے جلوہ گاہ تجلیات بنجائیں گے،
یا وہ ہمیشہ اپنے سینوں میں ایک ایسی آگ مشتعل پائیں گے جو کبھی نہ بجھ سکے گی۔

جناب اقبال کی تعمیل ارشاد، اور اُس عقیدت کی وجہ سے جو مجھے صاحب
سوانح کی ذات گرامی سے ہے یہ چند سطور بطور مقدمۃ الکتاب تحریر کی ہیں۔

میری دلی دُعا ہے کہ جس طرح حضرت اقدس کی ذات دُنیا والوں کے
لئے منبع فیوض ہے اُسی طرح اُن کا یہ مبارک تذکرہ لوگوں کے دلوں میں ایمان
و یقین کی لہریں دوڑا دے۔ فقط

عقیدت کیش

حامد سعید حامد، بھوپالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

التماس

عرصہ سے دلی تمنا تھی کہ مرشدی و مولائی حضرت مخدوم شہزادہ ناصرالدین محمد اسدالرحمٰن قدسی ادام اللہ ظلکم کے حالات زندگی پیش کر کے، دنیا کو انسانیت کا مکمل نمونہ بتادوں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے مقصد میں خاطرخواہ کامیاب نہ ہو سکا، اس لیے کہ بیشتر حالات باوجود سعی تمام فراہم نہ کر سکا انشاءاللہ آئندہ جیسا کہ میرا مصمم ارادہ ہے، آپ کی ذات قدسی صفات کے ہر پہلو کو نمایاں اور مفصل طریقہ سے ارباب علم و کمال کے سامنے پیش کرونگا، اگرچہ اس کام کی اہمیت اور اپنی ہیچمدانی کا پورا پورا اعتراف ہے، لیکن ممکن ہے کہ کسی کی نظر کیمیا اثر مجھ میں وہ قوت پیدا کردے کہ اگر کچھ نہیں تو کم از کم اُس کی قوتوں کا اظہار کر سکوں۔

حضرت اقدس کی ذات ستودہ صفات کے متعلق اس مختصر سی تمہید میں کچھ بیان کرنے کی جرأت حقیقتاً "سورج کو چراغ ہے دکھانا" کی مصداق ہوگا، میں بجز اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

"آفتاب آمد دلیل آفتاب"

بڑی ناانصافی ہوگی اگر میں حضرت نیاز اکبرآبادی کا خاص طور سے شکریہ نہ ادا کروں، اس لیے کہ مجھے بیشتر حالات موصوف ہی سے دستیاب ہوئے ہیں کرنل انعام اللہ خاں بہادر اور مولانا سید ابن علی بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔

اس تذکرہ کی تالیف سے میرا منشا صرف یہ ہے کہ اہل بصیرت، ذات گرامی

سے صرف متعارف ہی نہ ہوں بلکہ مبارک زندگی اور مقدس ہستی کے محاسن ظاہری و باطنی سے متمتع بھی ہوں۔

دوسرا منشا یہ ہے کہ وہ نونہالان اسلام جو مغربی تعلیم و تربیت کے زیر اثر اپنی زندگی مذہب سے آزاد اور بے نیاز بنائے ہوئے ہیں اپنے معاملات مذہبی کی صداقت و عظمت کا اندازہ کریں اور مغربی آزاد خیالیوں کے طلسم کو توڑ کر، شاہراہ حقیقت پر آجائیں، وما توفیقی الا باللہ۔

حضرت کا حلقہ بگوش خادم
اقبال

سلسلۂ نسب و حالات خاندانی

سوانح کی ترتیب میں خاندانی حالات کو ذاتی احوال پر سبقت دیجاتی ہے اور اُس کی وجہ صرف یہ ہے کہ صاحب سوانح کا دنیا سے ایک مکمل تعارف مقصود ہوتا ہے خاندانی حالات یا خصوصیات گو وجہ شرف نہیں ہو سکتے لیکن رواجی طریقہ کار سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس قسم کے حالات سوانح حیات میں کس قدر ضروری ہوا کرتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم نے اخوت و مساوات کا وہ درس دیا کہ افتخار و امتیاز نسب کا فخریہ اظہار ایک فعل عبث سمجھا جانے لگا۔

شرافت نسبی یا اعزاز خاندانی خدا تعالیٰ کے نزدیک ہرگز قابل وقعت نہیں ہو سکتے خدا کے نزدیک تو صرف وہ پاک نفسی و شرافت جو انسان کے اخلاق طبعی اور اعمال صالحہ کا حاصل ہو قابل وقعت ہے۔

اس لئے کہ صحیح معنوں میں شرافت ہر شخص کی ذات ہی سے تعلق رکھتی ہی شرافت کا اطلاق خاندان پر نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔

لیکن عام رواج کے مطابق شرافت کا اندازہ خاندانی اعزاز سے کیا جاتا ہے زمانۂ جاہلیت میں تو اس بات کا بہت زیادہ خیال کیا جاتا تھا لیکن ہر وقت اور ہر زمانہ میں دنیوی لحاظ سے لوگوں نے اسے ملحوظ رکھا ہے۔

حضور گرامی علیہ السلام کے خاندان کو بھی اہل عرب میں یہ خاندانی امتیاز یوں حاصل تھا کہ حضور اکرم ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو عرب کے تمام قبیلوں میں ممتاز تھا اور پھر اُس قبیلہ میں بھی حضور انور کی پیدائش کا فخر اُس گھرانے کو حاصل ہوا جو قریش کے تمام گھرانوں میں سب سے زیادہ وقیع تھا۔

خاندان کا اثر ضرور پڑتا ہے، اور عام طور پر شریف خاندان میں لوگوں کے اطوار وخصائل پسندیدہ ہوتے ہیں چنانچہ جو اوصاف اہل بیت میں پائے جاتے ہیں، وہ مشکل سے کسی دوسرے فرد میں ملتے ہیں، جن کا سلسلۂ نسب شہنشاہ دو عالم سے ملتا ہے، جن کی رگوں میں حضور رسالت مآب کا مبارک خون موجزن ہوتا ہے، ان میں اخلاق حمیدہ، اوصاف جمیلہ، یقیناً امتیازی ہوتے ہیں۔ ہمارے مرشد و آقا کا سلسلۂ نسب بھی خاندان رسالت سے ملتا ہے، جیسا کہ شجرۂ پاک سے ظاہر ہے۔

شجرۂ طیبہ

خواجہ ناصر الدین محمد اسد الرحمٰن قدسی بن سیف الحق حضرت محمد حبیب الرحمٰن بن حضرت علی اشرف معروف بہ بندگی شاہ نجف بن حضرت احمد ملقب بہ خواجہ عالم بن حضرت قطب الاقطاب فخر الدین انیرد بن حضرت خواجۂ خواجگان شرف الدین الٰہی بن حضرت قطب الدین بن حضرت خواجہ محمد عاقل بن حضرت زین الملت والدین محمد ناصر بن حضرت علامہ محمد رجل بن حضرت شیخ الاسلام ابی المکارم بن حضرت ابو المحاسن بن حضرت شاہ ابو الفیض بن حضرت شیخ المشائخ ابو الفضل بن حضرت عبدالباقی بن حضرت ابو المعالی بن حضرت عبد الواہب بن حضرت ابو الحیات بن حضرت غوث الاغیاث محمد ناصر بن حضرت محمد ماہ بن حضرت محمد معروف بہ امیر ناصر بن حضرت امیر مسعود بن حضرت امیر محمود بن حضرت ابی احمد بن حضرت داؤد بن حضرت ابی ابراہیم بن حضرت اعراجی بن حضرت موسیٰ مبرقع بن حضرت محمد تقی بن حضرت علی رضا بن حضرت موسیٰ کاظم بن حضرت سلطان الاولیا سید الطائفہ امام الطریقت سیدنا جعفر صادق بن حضرت محمد باقر بن حضرت زین العباد بن حضرت سید الشہدا حسین بن حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

حضرتِ اقدس کا خاندان حضور انور علیہ السلام کے زمانے سے آج تک لوگوں کے دلوں پر فرمانروائی کرتا چلا آرہا ہے، حضور رسالت مآب کے بعد سے برابر حضرت اقدس دام برکاتہم تک نسلاً بعد نسلٍ حضرت کے بزرگوں کے سر ولایت کا سہرا رہا ہے، خدا کے محبوب ترین بندے اور جلیل القدر اولیا اللہ حضرت کے خاندان میں ہوئے ہیں جو ہمیشہ مخلوق کی فلاح وبہبود میں سرگرم کار رہے ہیں اور جن سے بیشمار مخلوق خدا نے آج تک دینی و دنیوی فیض پایا ہے۔

حضرت کے والد بزرگوار امام الاتقیا شیخ المشائخ حضرت شاہ حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ حضور نے جس فیاضی کے ساتھ چشمۂ فیض وہدایت جاری فرمایا تھا وہ آج نہ صرف بھوپال میں بلکہ دور دراز ملکوں میں تشنگان حقیقت کو سیراب کر رہا ہے، حضور کے ادنیٰ ادنیٰ خدام ایسے تھے جن کے فیوض وبرکات روز روشن کی طرح ظاہر ہیں۔ حضرت بابا تاج الدین علیہ الرحمۃ جو ناگپور میں رونق افروز رہے اور جن کی ذات گرامی سے دور دور تک لوگ واقف ہیں، حضور ہی کے فیضیافتہ تھے۔

شاہ عبد الرحیم جن کے قدم مبارک کی برکت سے آج ریاست حیدرآباد باعث خیر بنی ہوئی ہے، حضور ہی کے حلقہ بگوشوں میں سے تھے۔ میاں چمن شاہ رحمۃ اللہ علیہ جن کا وجود اہل بھوپال کے لئے مبارک ومسعود تھا اور جن سے صدہا بندگان خدا کے کام بن جایا کرتے تھے وہ حضور ہی کے پرتو فیض وتربیت تھے اور شب وروز خدمت پر مامور۔

غرض حضور کی ذات گرامی وہ تھی جس کی حقیقت بیان کرنا محال ہے حضور اقدس قطب الاقطاب مجدد وقت حضرت مولانا عبد القدوس گنگوہی قدس اللہ سرہٗ کے نواسے زادہ اور حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے حقیقی خواہرزادے تھے

مادری سلسلۂ نسب کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو بھی حضرت اقدس کا خاندان فلک عزت پر آفتاب کی طرح چمک رہا ہے۔ حضرت کی والدۂ محترمہ ایک بڑی خدا رسیدہ حافظ قرآن خاتون تھیں اور اپنے زمانہ کی رابعہ، باطنی اور روحانی حالت جو ممدوحہ کی تھی وہ بیان سے باہر ہے، آپ حضرت مولانا میاں محمد اسحاق جاگیردار علیہ الرحمۃ کی صاحبزادی تھیں، جو بھوپال کے بلند پایہ عالم دین تھے اور متعدد زبانیں جانتے تھے۔ موصوف کی تصانیف اب تک مصر وغیرہ کے مدرسوں میں داخل نصاب ہیں۔

مولانا میاں محمد اسحٰق علیہ الرحمۃ، مولوی جمال الدین انصاری وزیر اعظم ریاست بھوپال کے حقیقی نواسے تھے، محترم وزیر اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے انوار علیہ وسخائے طبع سے آجتک لوگ فیض پا رہے ہیں اور مرحوم کا نام زندہ ہے۔

غرض ہمارے حضرت کو جو خاندانی اعزاز حاصل ہے وہ بھی ظاہر ہے۔

ولادت

ولادت کی مسعود شب میں آپ کی والدۂ محترمہ نے سورۂ یوسف تلاوت فرماکر آرام کیا تھا، عالم خواب میں ملاحظہ فرمایا کہ صبح کا روشن ستارہ ٹوٹکر آغوش مبارک میں آگیا ہے۔ بیدار ہونے پر تعبیر کا آغاز ہوا اور ولادت باسعادت کے بعد معلوم ہوگیا کہ مبارک خواب کی تعبیر یہی نوزائیدۂ سعادت تھا جو سورۂ یوسف کی برکات سے مزین تھا اور شاید اسی لئے قدرت نے آپ کی والدہ محترمہ کی زبان مبارک سے، آپ کی نسبت جو پہلا لفظ نام کے لیے نکلوایا تھا وہ یوسف تھا، اس طرح آپ اس نام مبارک سے موسوم ہوئے۔ مگر بعد کو آپ کا لقب ناصر الدین محمد، اسم ذاتی اسد الرحمٰن، اور عرفیت شہزادۂ قدسی قرار پائی۔

تاریخ ولادت ۱۳ رجب سنہ ۱۳۱۳ ہجری روز دوشنبہ وقت صبح صادق۔

ولادت کے بعد جو خاص واقعہ آپ سے ظاہر ہوا وہ یہ تھا کہ آپ بعد تولد ذرا بھی نہ روئے، جیسا کہ عام طور پر تمام نوع انسان کی جبلت ہے اور پھر یہ سکوت دو چار ہی دن نہیں بلکہ کامل دو سال تک رہا۔ اس اثناء میں آپ کو ہنسانے اور رُلانے کی بلیغ کوشش کی گئی مگر سب بے سود ثابت ہوئی اور تمام خاندان کو نہ صرف شبہ بلکہ یقین ہوگیا کہ آپ نطق و سماعت سے محروم اور بے بہرہ ہیں۔

اہل باطن کو تو اس راز کی خبر تھی اور آپ کے والدین بھی واقف اسرار تھے، لیکن عام اشخاص اس حقیقت سے ناآشنا تھے، بعض اہل صفا اس گہری خاموشی سے اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ روح کو علوم باطنی کی تلقین کیجا رہی ہے اور بمصداق "عَلَّمَ الاَسْمَاءَ کُلَّھَا" ایک غیر محسوس تدریس و تربیت ہو رہی ہے۔

بعض نے کہا کہ مقامات عرفان طے ہو رہے ہیں، اس لئے یہ ظاہری بے تعلقی ہے کہ کام میں خلل نہ آئے۔ بہرکیف آپ آغوش مادر میں مراحل سلوک طے کرتے رہے آخر وہ دن بھی آیا جبکہ پورے دو سال کے بعد ۱۵ شعبان سنہ ۱۳۱۵ھ کی رات کو زبان فیض ترجمان سے الامان والحفیظ کی صدائے حقیقت بلند ہوئی، اس خرق عادت نے اہل ظاہر اور باطن میں ایک ہل چل پیدا کر دی۔ اُسی رات کی صبح سے ہنسنا اور بولنا بھی شروع ہوگیا۔ اس دو سالہ مدت میں آپ پیر کے دن دودھ نہیں پیتے تھے گویا روزہ ہوتا تھا۔ روزہ کیا تھا! مجاہدات شاقہ کی خبر تھی جیسا کہ جوانی میں ظاہر ہوا۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو آپ اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ وضو کرتے اور جب وہ نماز پڑھتیں تو خود بھی نماز پڑھتے۔

چنانچہ بچپن ہی میں اکثر خوارق و کرامات کا ظہور ہوتا رہا اور سمجھنے والے سمجھتے رہے کثافت سے دور رہنا صاف ستھری جگہ کو پسند کرنا، کھیل کود سے نفرت شور و غل سے پرہیز۔

بچپن

بالائے سرش زہوشمندی
میتافت ستارۂ بلندی

وہ مولودِ مسعود جو تولد سے قبل ہی باریاب بارگاہ ایزدی ہوچکا تھا اور جس کے لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ روزِ ازل ہی میں قرعۂ انتخاب اُس کے نام پڑچکا تھا، جب پیدا ہوا تو ایک باکرامت وجود لیکر آیا ، سیمائے منور سے تمام آثار سعادت نمایاں تھے، آپ کا بچپن ایک ایسے مقدس اور بزرگ کام کی تمہید تھا جس کی عظمت و قدسیت سے صرف وہی قلوب واقف تھے جنھیں اسرارِ غیبی سے کوئی حصہ ملا تھا، ایسی بزرگ ہستیوں کو جن کی تخلیق کا مقصد کسی ربانی منشار کی تکمیل ہوتی ہے، فطرت خود اپنی مقدس آغوش میں تربیت دیتی ہے۔ اور اسی طرح کی بہت سی باتیں جو اکثر لوگوں کی نظروں میں عجیب معلوم ہوتی تھیں آپ سے ظاہر ہوتی تھیں" جب عمر شریف چار سال کی ہوئی تو ایک رات آپ کی والدہ محترمہ نے سُنا کہ آپ سوتے میں کچھ پڑھ رہے ہیں ممدوحہ کو ثقل سماعت تھا مونھ کے قریب کان لگایا اور پوری یٰسین شریف اس طفل معصوم سے سنی، جب پانچ برس کے ہوئے تو حضرت کی والدہ ماجدہ نے خواب میں دیکھا کہ آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو از اول تا آخر قرآن شریف سُنایا حضور اکرم خوش ہوئے اور سر پر دست مبارک رکھا، اس کے بعد حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہٗ کو دیکھا کہ ایک بڑا تھیلا لائے جس میں اخروٹ کے برابر برابر کوئی شے تھی، فرمایا کہ سرکار دو عالم نے یہ اس طفل قدسی صفات کے لیے عطا فرمایا ہے، اس کا ہر دانہ ایک سلطنت کی قیمت سے بڑھکر ہے اور میں اس نونہال فرخندہ فال کا دادا

علی ہوں۔

تعلیم

چھ برس کی عمر سے پڑھنا لکھنا شروع ہوا، سات سال تک حضور قبلہ گاہی قدس سرہٗ کے زیر نظر تعلیم ہوتی رہی، اس کے بعد تقریباً پانچ سال تک لاہور میں قیام فرما کر متعدد اور مختلف علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کی۔ زمانہ تعلیم میں بھی تصرفات اور خوارق عادات کا ظہور برابر ہوتا رہا، چنانچہ آپ کا پُر وقار طرز عمل، سنجیدہ اطوار، اخلاق ستودہ اوصاف جمیلہ بالکل ایک کرامت اور خرق عادت میں شمار کرنے کی باتیں ہیں۔

زمانہ طالب علمی میں جبکہ آپ لاہور میں قیام فرماتے تھے آپ سے بہت سے تصرفات ظاہر ہوئے، اکثر لڑکے آپ کے تصرف اور ہمت باطنی سے راہ راست پر آ گئے آپ کو لاہور میں عام ہر دلعزیزی حاصل تھی اکثر لوگ طالب دُعا ہوتے اور خدا تعالیٰ آپ کی دُعا کی برکت سے اُن کی مراد پوری کرتا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں جب امریکا کے مشہور مسمرایزر ڈاکٹر نکولا نے لفٹنٹ گورنر پنجاب کے سامنے اپنی قوت مقناطیسی کے تماشے دکھائے، تو آپ بھی وہاں موجود تھے لیکن آپ پر اُس کا مطلق اثر نہیں ہوا اور نکولا کو آپ کی روحانی قوت کا اعتراف کرنا پڑا، اُس وقت عمر شریف صرف سولہ سال کی تھی۔ آپ میں ہمدردی کا مادہ بچپن ہی سے بے نہایت ہے بعض واقعات لاہور میں آجتک مشہور ہیں۔

ایک مرتبہ آپ تعلیم گاہ سے دار الاقامت کی طرف واپس آرہے تھے راستہ میں ایک بوڑھی عورت کو دیکھا جس کے سر پر لکڑیوں کا ایک گٹھا تھا اور وہ کہتی جارہی تھی "اللہ امیرے پاؤں تو اب نہیں اُٹھتے" یہ بوجھ گھر تک کس طرح پہنچیگا۔

آپ نے بڑھیا سے پوچھا تم کہاں رہتی ہو، اُس نے گھر کا پتہ بتلایا، آپ نے فرمایا" لاؤ یہ لکڑیوں کا گٹھا میں لیچلوں، یہ کہکر آپ نے اُس کے سر سے لکڑیوں کا گٹھا اتار لیا اور اُس گٹھے کو بغل میں دابکر بڑھیا کے ساتھ ہو لئے، راستہ بھر ضعیفہ دُعائیں دیتی رہی آپ نے اُس کے مکان تک اُس بوجھ کو پہنچایا اور ضعیفہ کو ایک روپیہ بھی دیا۔ یہ واقعہ ایثار کی ایک معمولی مثال تھا۔

لاہور میں آپ خود تعلیم حاصل کرنے نہیں گئے تھے بلکہ دوسروں کی تعلیم کے لئے خدائے تعالیٰ نے آپ کو وہاں پہونچایا تھا۔

آپ کے رُعب بزرگانہ کا یہ حال تھا کہ آپ سے زائد عمر کے طلبا بھی آپ سے نہایت ادب واحترام کے ساتھ پیش آتے تھے اور باہمی کیسا ہی مذاق ہو رہا ہو لیکن اگر حضرت اقدس اُدہر سے گزر جاتے تھے تو ایک سناٹا سا چھا جاتا تھا، لڑکوں کی تمام فریادیں بجائے سپرنٹنڈنٹ آپ کے سامنے پیش ہوتی تھیں اور بڑے سے بڑے جھگڑے کو آپ ذرا میں فیصل فرما دیتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی بورڈنگ کے لڑکے اور کسی غیر شخص سے سخت جھگڑا ہو رہا تھا، ایک جم غفیر تھا، حضرت اقدس بھی کہیں سے تشریف لا رہے تھے، یہ واقعہ دیکھکر ٹھیر گئے اور استفسار فرمایا، وہ شخص بورڈنگ کے لڑکے کو مارنے پر آمادہ تھا اور سخت غصہ کا اظہار کر رہا تھا، آپ نے قریب پہونچکر فرمایا کہ اگر تم کو مارنا ہے تو مجھے مار لو اور اس لڑکے کو چھوڑ دو، اُس شخص نے شرمندہ ہو کر نگاہیں نیچی کر لیں اور چلا گیا۔

بورڈنگ کے لڑکوں میں یہ لڑکا نہایت شریر اور فسادی تھا، لیکن اس قصہ اور حضرت کے اس ایثار سے اس پر اتنا اثر ہوا کہ یکلخت اُس کا طرز عمل بدل گیا غرضکہ حضرت اقدس کے قیام سے تمام بورڈنگ کے لڑکوں میں دینی

روح پھک گئی اور اچھائیوں نے دلوں میں گھر کر لیا۔ حصول تعلیم کی کوشش اور مخلوق خدا کی اصلاح میں مشغولی کے باوجود بھی، حضرت اقدس اپنے روحانی مشاغل کے لیے وقت نکال لیتے تھے، اور جب موقع ہاتھ آتا تھا علمائے دین اور اولیاء اللہ سے ملاقات فرماتے تھے۔ تعطیل کے دن حضرت اقدس مزارات پر تشریف لیجاتے اور تعطیل کلاں میں قرب وجوار کے شہروں، ملتان، راولپنڈی جموں، کشمیر، امرتسر، انبالہ میں بزرگان دین کے مزارات پر فاتحہ پڑھنے تشریف لیجاتے تھے۔

ہر اتوار کی تعطیل حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر گذرتی تھی غرضکہ آپ نے قیام لاہور کے زمانہ میں اس قدر ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی کہ ہر مذہب و ملت کا آدمی اور ہر چھوٹا بڑا آپ کو محبت کی نظر سے دیکھتا تھا، اور جب آپ کسی طرف سے گذرتے تھے تو لوگ آپس میں کہتے تھے کہ یہ نوجوان ایک فرشتہ صفت ہے۔

درویشانہ زندگی

اس سے پہلے کہ حضرت اقدس کی درویشانہ زندگی پیش کیجائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اضافۂ معلومات کے لیے تصوف پر مختصراً بحث کی جائے۔

تصوف کی بنیاد جب اور جیسے بھی پڑی ہو، اس سے ہمیں اس وقت بحث نہیں ہے، کیونکہ اُس پر کافی سے زیادہ بحث اور تبصرے ہو چکے ہیں، دیکھنا صرف یہ ہے کہ حقیقتاً علم تصوف کا موضوع اور منشا کیا ہے،

علم تصوف اور علوم کی طرح اگرچہ اکتسابی نہیں، ذوقی ولدنی ہے، لیکن اس کی عملیت، علمیت اور اکتساب کا بھی بڑا حصہ اپنے میں شامل رکھتی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اس پر علمی حیثیت ہی سے بحث کیجائے۔

تصوف کا موضوع ذات باری ہے، اور اُس کا منشاء مراتب عبدیت و معبودیت کی تشریح، یا انسان جو مظہر ذات احدی کہا جاتا ہے اور تشخصات و تعینات کی وجہ سے ذات باری سے جدا ہوگیا ہے، اُس کی تحلیل، اور اُس کا تجزیہ، اس علم کا مقصد اصلی ہے۔

روحانیت جو جان تصوف کہی جاسکتی ہے، مابین خالق و مخلوق ایک خاص رابطہ ہے، اس نظام مادی میں صرف روح ایک ایسی چیز ہے، جسے عالم ارواح سے براہ راست تعلق خصوصی حاصل ہے، اگرچہ حجابات مادی اس پر پڑے ہوئے ہیں اور خود اتحاد جسمی اُس کے لیے وجہ فراق بنا ہوا ہے لیکن ظلمت مادی کو رفع کرنے کے بعد ہم ذات خداوندی سے واصل ہوسکتے ہیں، چنانچہ علم تصوف، ہم کو وہ تمام اصول تلقین کرتا ہے جس سے ہم ظلمانیت روح کو تجلیات سے تبدیل کرسکتے ہیں۔ اسی ذیل میں ہم چند اقوال نقل کرتے ہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا ارشاد ہے کہ خالق و مخلوق میں عدم واسطہ کا نام تصوف ہے، ابو محمد جریری نے کہا ہے کہ اچھی عادتوں کا اختیار کرنا اور بُری عادتوں کا چھوڑنا تصوف ہے، سمنون نے کہا ہے، تصوف یہ ہے کہ نہ تیرا کسی پر قبضہ ہو اور نہ تجھ پر کسی کا اختیار، رویم کا قول ہے، تصوف یہ ہے کہ خود کو خدا کے حوالے کردیا جائے، حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا ہے کہ گروہ صوفیا، وہ گروہ ہے جو ہر شئے کو چھوڑ کر اللہ کو اختیار کئے ہوئے ہے۔

چونکہ تصوف کا تمام دارومدار صرف ارتقائے روحانیت اور انجلائے ظلمت نفسانیت پر ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک جامع اور مختصر تبصرہ روحانیت پر کرلیا جائے اس سے ایک فائدہ یہ بھی متصور ہے کہ آج جبکہ دنیا مادی ارتقا کے لحاظ سے زمانۂ پیشین سے بہت آگے ہے لیکن اُسی کیساتھ

روحانی عروج و ترقی کے اعتبار سے بہت پیچھے ہے اس لیئے مادہ پرستی تقریباً ہر دماغ پر محسوس یا غیر محسوس طریقے سے مسلط ہے اور یہی وجہ ہے کہ علوم روحانی کی بے قدری ہوتی جا رہی ہے۔ روحانیت کے اس دورِ کس مپرسی میں جو چیز اس مقدس علم کو سب سے زیادہ بدنام کر رہی ہے وہ اُن نام نہاد صوفیاء کا طرزِ عمل ہے جو دنیا کمانے کے لئے باکمالوں کے بھیس میں نمودار ہو کر اپنا بھرم کھلنے کے بعد عامۃ الناس کو اس مقدس طبقہ کی طرف سے بدظن بنا دیتے ہیں۔

روحانیت جس کا مطمحِ نظر صرف عرفان اور معرفتِ الٰہی ہے اور جس پر تقریباً تمام دُنیا کے مذاہب چند فروعی اختلاف کے بعد متحد نظر آتے ہیں وہ مقصدِ گرامی ہے جو ہماری تخلیق کا حقیقی منشاء ہماری پیدائش کا اصل راز ہے ظہورِ کونین سے مقصود معرفتِ الٰہی ہے جیسا کہ حدیث قدسی سے ظاہر ہے۔

جب حضرت داوُد علی نبینا علیہ السلام نے جناب باری میں عرض کیا کہ مخلوقات کا منشاءِ تخلیق کیا ہے وحی آئی "کہ اے داوُدؑ میں گنج مخفی تھا مجھے میرا معروف ہونا محبوب ہوا اس لیے میں نے مخلوق کو پیدا کیا تا کہ میں معروف ہو جاؤں"

مے برد احببت من اعرف مرا
ورنہ کو اہلیتِ آن صف مرا

اس تمام کلام کا حاصل یہ ہے کہ ذات باری نے اپنے معروف و مشہور ہونے کے لیے عالم کو اپنے اسماء و صفات کا مظہر بنایا حصول معرفت الٰہی کے دو طریق ہیں ایک علماٗ سے مخصوص ہے جس کو معرفت استدلالی کہتے ہیں اور جو مفید یقین نہیں دوسرا طریق مخصوص انبیاء، اولیا اور عُرفا کے لئے ہے یعنی معرفت کشفی و شہودی۔

منازل معرفت کے سالک کے لیے سب سے زیادہ ناگزیر قوائے روحانیہ میں ایک انجلائی کیفیت پیدا کرنا ہے کیونکہ روح اگرچہ ایک جوہر نورانی ہے مگر ارتباط جسم خاکی و امتزاج مادی کی وجہ سے اُس کی نورانیت مکدر ہو جاتی ہے علاوہ ازیں ہمارے اخلاق رذیلہ اور ملکات ردیہ اُس کی نورانیت کو تاریک بنا دیتے ہیں اس لیئے ضرورت ہے کہ شائقان کرامت روحانی و طالبان خوارق انسانی سب سے پہلے اصلاح نفس کی طرف متوجہ ہوں، تزکیۂ نفس یا تو کسی مرشد طریقت کے زیر تربیت ہو سکتا ہے اور یا ذاتی مجاہدات و فطری استعداد کی وجہ سے تزکیہ نفس کے بعد روح اس قابل ہو جاتی ہے کہ مدارج ارتقا کو بتدریج طے کر سکے۔ کشف و کرامات اور خوارق عادات تو روحانیت کا معمولی کرشمہ ہے۔ روحانیت کا منتہائے نظر تو عرفان خداوندی ہی ہے جیسا کہ اوپر گذرا۔

اصل تصوف جس چیز کا نام ہے وہ کرامات اور خوارق عادات کی شعبدہ بازیوں سے بے نیاز ہے یہ تو صرف ان فقیروں کا ذریعہ معاش ہے جو کرامت کے نام کو بدنام کرتے پھرتے ہیں۔ وہ کرامتیں جن کا ظہور اولیائے کرام سے ہوا ہے یا وہ معجزات جو انبیاء عظام سے طلب کئے گئے ہیں وہ صرف مصالح ہنگامی کو دیکھتے ہوئے رونما ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ زمانے ایسے تھے جب مذہب کی طرف سے ایک جہل مطلق پھیلا ہوا تھا، ورنہ نبوت یا تصوف کرامات اور معجزات کا نام نہیں ہے، یہ ایک عقلی ضعف ہے جو آجکل عالمگیر ہے کہ بزرگوں کے مراتب قربت کا اندازہ ان کی کرامات سے کرنا چاہتے ہیں، کرامت ایک شے دیگر ہے ہر شخص قوائے روحانیہ کو تربیت دینے کے بعد بہت سی محیر العقول کرامتیں دکھا سکتا ہی مگر ناممکن ہی کہ بغیر مجاہدہ اور ریاضت کے یا استعداد فطری اور توفیق ربانی کے وہ ولی کامل اور ہادی عصر بنجائے۔

کسی شخص سے ظہور کرامت تو اُن کے ولی ہونے کی دلیل نہیں، کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر عاملان مسمریزم سب کے سب ولی اور صوفی کہلائے جا سکتے ہیں،

ہاں ایک صوفی صافی کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ باکمال بھی ہو اور اس کا اندازہ ارباب نظر ہی کر سکتے ہیں اس طبقہ کی کرامت نمود اور نمائش کے لیے نہیں ہوتی بلکہ وہ ان کا ایک عالم خاص ہوتا ہے جہاں اُن سے بہت سی ایسی مافوق العادات وفطرت باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جن کی اُنھیں خود بھی خبر نہیں ہوتی۔ ان کے تصرفات باطینہ کا ہمیشہ مطمح نظر خلق اللہ کو بحکم اللہ فائدہ پہنچانا ہوتا ہے، یا بعض وقت ان تصرفات سے وہ لوگوں میں مذہب اور مذہب بھی کون سا مذہب، دین اسلام، کی عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں،۔

بہرحال ان کی یہ کرامتیں، مصالح خداوندی اور لطیفۂ غیبی، ہوتی ہیں جن کا ظہور خاص مواقع پر ہوتا رہتا ہے۔

مجاہدات

یوں تو آپ فطرتاً مجاہدین اور آغوشِ مادر ہی میں آپ کے مجاہدات کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن دنیوی اور ظاہری اعتبارات سے آپ کے مجاہدات کا دور جبکہ مستقل طریقہ سے انہیں اپنا شعار زندگی بنا لیا گیا تھا، ۲/ ذی الحجہ ۱۳۲۱ھ سے شروع ہوتا ہے۔

اختتام تعلیم کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ حضور قبلہ گاہی نے اس جہان فانی سے رحلت فرمائی "انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس حادثۂ جانکاہ یعنی پدر بزرگوار کے فراق جسمانی کے باوجود حضرت اقدس ارباب طریقت کے مراسم اصول کے مطابق ریاضات ومجاہدات میں مشغول ہو گئے اور سالہا سال دشوار ترین ریاضات

اور سخت ترین مجاہدات کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ازل ہی سے اپنے بندوں میں چند ہستیاں مخصوص کر لی تھیں جنہوں نے دنیا میں آکر اپنے آپ کو اُس کی راہ میں مٹا دیا، اور دشوار گذار راستوں اور سخت سے سخت منزلوں سے گزر گئے۔

حضرت اقدس جب سے پیدا ہوئے اُسی وقت سے خدا تعالیٰ کی راہ میں برابر اپنی ثابت قدمی کا ثبوت دیتے رہے حضور قبلہ گاہی کے ارشاداتِ ہدایات پر جو حضرت اقدس کے رہبر طریقت بھی تھے اس طرح عمل پیرا رہے کہ دنیا میں ایسی مثالیں کم مل سکتی ہیں۔ یوں تو جس طرح اللہ نے آپ کو اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے ۔ اُسی طرح آپ نے بھی خود کو اللہ تعالےٰ کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ لیکن حضور قبلہ گاہی کی رحلت کے بعد تو آپ نے خدا کی راہ میں بالکل ہی اپنے آپ کو مٹا دینے کی صورتیں پیدا کر لیں، جس وقت والد ماجد کا وصال ہوا اس وقت عمر شریف صرف سترہ سال کی تھی یہ وقت بہت صبر آزما تھا اول تو محبوب ترین ہستی سے جُدائی دوسرے والدۂ محترمہ اور چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کا ساتھ لیکن آپ نے سب باتوں سے اپنا مونھ موڑ کر سب کو خدا کے حوالے کیا اور آپ خدا کی جستجو میں چلنے کے لیے مستعد ہو گئے۔

غرض حضرت اقدس والدۂ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی زندگی خدا کی محبت میں صرف کر دینے کی خواہش ظاہر فرماتے ہوئے عرض کیا۔
میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے بہن بھائیوں کی کفالت، میری جفاکشی اور تلاشِ معاش پر منحصر ہے لیکن میرا ایمان ہے کہ وَفِی السَّمَاءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوعَدُونَ، والدۂ محترمہ بے انتہا مسرور ہوئیں اور ہمت افزا الفاظ میں دلی دُعاؤں کے ساتھ اپنے لختِ جگر کو ایسے سخت وقت میں خدا حافظ کہدیا اور فرمایا کہ جاؤ خدا تم کو

کامیاب کرے۔

یہ واقعہ حضرت اقدس کی والدۂ محترمہ کے جذبات وخیالات پر مکمل روشنی ڈالتا ہے۔

حضرت اقدس جملہ مہمان فقرا اور اہل اللہ سے جو بغرض تعزیت آستانۂ مبارک پر حاضر تھے گوشہ نشینی کی اجازت حاصل کر کے مخلصانہ دعاؤں کے ساتھ ٹیکری منوا بھانڈ کی طرف روانہ ہوگئے اور اس وحشتناک پہاڑ کو اپنا گوشۂ عزلت بنا لیا۔ چار ماہ تک حضرت مدظلہ نے اس جگہ اقامت فرمائی۔

اس عرصہ میں تین چلے مسلسل کئے اور ان تمام ایام میں صرف پانچ خرموں سے روزانہ روزہ افطار فرمایا۔ فرائض و واجبات وسنن کا خاص التزام تھا، اس ٹیکری پر پانی کی بڑی قلت تھی، جب تک آپ وہاں رونق افروز رہے آپ کے چھوٹے بھائی ہارون الرشید حفظ اللہ تعالیٰ تیسرے روز پانی بھر آیا کرتے تھے، ایک مرتبہ برادر معز کو شدید بخار آ گیا جس کی وجہ سے چھ روز تک پانی نہ پہونچ سکا اور آپ پیاسے رہے، جب شدت تشنگی سے حالت ابتر ہوئی تو اس خیال سے کہ جان بچانا فرض ہے پانی کی تلاش میں آپ پہاڑی سے نیچے اترے چونکہ مسلسل روزوں نے بہت نحیف وناتواں کر دیا تھا اس لئے بدشواری تمام بہت دیر میں پانی کے قریب پہونچ سکے۔

ہنوز جھیل سے سو سوا سو قدم کا فاصلہ باقی تھا کہ ٹھوکر لگی اور آپ ایک گڈھے میں جس میں جھاڑی اور کانٹے کثرت سے تھے گر پڑے، تمام جسم مبارک زخمی ہو گیا اور اکثر اعضائے بدن سے خون جاری ہو گیا۔

قبل اس کے کہ آپ زخموں کی طرف متوجہ ہوں سربسجود ہو گئے اور بارگاہ خداوندی میں عرض کیا کہ بیشک میں نے بڑی خطا کی جو توکل کے خلاف کیا، میں

اس سے زیادہ سزا کا مستحق تھا۔ غرض سجدے سے اُٹھے اور بغیر پانی لئے ہوئے جائے قیام کی طرف واپس تشریف لے گئے۔

ٹیکری سے واپس تشریف لانے کے بعد مسلسل تین سال تک والدہ ماجدہ کی خدمت کی، یہ زمانہ بہت سخت گذرا ہے، ذرائع آمدنی مسدود تھے۔ اقربا اعزا درویشانہ زندگی پر ہنستے تھے اور توکل علی اللہ پر مضحکہ اُڑایا جاتا تھا، احباب کی بے سروپا باتیں، مشورے، انتہائی تکلیف دہ ہوتے تھے، لیکن حضرت کی نظر میں ان کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اس عرصہ میں کبھی کبھی والدہ محترمہ کی اجازت سے جنگلوں اور پہاڑوں پر بھی خلوت گزینی و ریاضت کا مشغلہ ہوتا رہا۔ ۱۳۴۳ھ میں والدہ محترمہ نے وفات پائی اور حضرت نے سب سے کنارہ کش ہوکر باغ فرحت افزا کی مسجد میں قیام فرمایا، یہ ایک بہت ہی وحشتناک جگہ ہے لیکن آپ کے مجاہدات اور ریاضات اسے رشک گلشن بنائے ہوئے تھے ایک مرتبہ حضور نے دس ماہ تک مسلسل روزے رکھے اور افطار کے وقت صرف ایک پیالی بغیر دودھ اور شکر کی چائے نوش فرمائی اور وہی ایک پیالی بوقت سحر، یہ ایسی باتیں ہیں جن پر ہم جیسے دُنیا دار انسان حیران ہیں لیکن آج بھی ان باتوں کے دیکھنے والے موجود ہیں اور بلند آواز سے کہہ سکتے ہیں۔

عرصہ تک دہلی، پیران کلیر، پاک پٹن، پانی پت اور اجمیر وغیرہ میں چلہ کشی فرمائی ہے اور افطار و سحر کا معمول وہی دو پیالی چائے یا انتہا سے انتہا چند خرمے رہا ہے ان مجاہدات کا حال سُنکر بدن تھرا جاتا ہے اور جذبۂ دینی کہہ اُٹھتا ہے

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

سالہا سال مسلسل حوصلہ شکن ریاضتیں اور تحیر انگیز مجاہدے فرمائے، رات

رات بھر کھڑے رہنا، ہفتوں بیدار رہنا، زمانہ عیش و کامرانی میں ترک دُنیا کر دینا ایک حیرت ناک واقعہ ہے۔

عبادات و ریاضات کا بالتفصیل تذکرہ قطعی دشوار ہے اور صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں آپ کی ریاضات بے مثل ہیں، عبادات شرعیہ میں سے کوئی چھوٹا سا چھوٹا جزو بھی آپ سے نہیں چھوٹتا۔ بزرگان طریقت اولیاء کرام کے جتنے بھی طریقے موافق قرآن اور حدیث ہیں آپ اُن سب پر عامل ہیں۔ اور آپ کی مبارک زندگی ان آیات شریفہ کی روشن تفسیر ہے۔

قد افلح من زکھا و قد خاب من دسھا (والشمس)	اس نے فلاح پائی جس نے تزکیہ نفس کیا اور گمراہ ہوا جس نے اپنے نفس کو بگاڑ دیا۔
و اما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی (والنزعت)	اور جو ڈرا کہ ایک دن خدا کے حضور جانا ہوگا اور اس خوف سے ہوائے نفس سے اجتناب کیا اُس کی جگہ بے شک جنت ہوگی۔

او من کان میتاً فاحیینہ وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمت لیس بخارج منھا۔ (الانعام)	ایسا شخص جو کہ پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اُس کو زندہ کیا اور ہم نے اُسکو ایک ایسا نور دیا کہ وہ اُسکو لیے ہوئے لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کیا ایسا شخص اُس شخص کیطرح ہو سکتا ہے جسکی حالت یہ ہو کہ وہ ایسی تاریکیوں میں پھنسا ہوا ہو جنسے کہ وہ نکلنے نہ پاتا ہو۔

انکشافِ ولایت

آج مادہ پرستی کی غلط کاریاں اپنی تاریکیوں کے ساتھ ... ار حقیقت سے دست وگریبان ہیں، کون ہے جو تاریک اجسام انسانی میں روح یا نظام روحانیت کے ایسے انوار کا قائل ہو، جو عالم قدس کے جہاں افروز لمعات، یا خورشید ازل کی ذرہ نوازیوں سے جلوہ انگیز ہیں۔ موجودہ مادہ پرستی نے اسرار روحانیت کی طرف سے آنکھیں چرا رکھی ہیں لیکن کیا شپرک کی کورچشمی سے آفتاب کی ضیاء پاشی غلط ثابت ہوسکتی ہے یا کورچشمان حقیقت کے عدم ادراک سے روز وشب کا تبیان مٹ سکتا ہے۔ جبکہ کائنات کے ہر ذرہ میں تجلیات الٰہی مضمر ہیں تو انسان جو ذات خداوندی کا مظہر اتم اور عالم صغیر کہلاتا ہے اس نور ربانی کا پرتو نہیں ہوسکتا جس کو صرف حقیقت آشنا نگاہیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے تو ضمیر انسانی کو عقل سلیم ایسا تجلی خانہ تسلیم کرتی ہے جس نے مادی اسرار اور لفظی ومعنوی حقائق کو روشن کردیا ہے جس کا ارتباط سرچشمۂ ازل سے ہر لمحہ انوار معرفت اقتباس کررہا ہے، یہ اُسی کی ادنے ترین جلوہ طرازیاں ہیں جو آنکھوں میں نگاہ بنکر اور دل ودماغ میں فکر وخیال ہوکر کام کررہی ہیں۔

واردات ضمیر یا تصرفات قوت روحانی کا نظام اس کارخانہ عناصر سے بالکل جدا اور روداد عالم ذوق وکیفیات بیان سے بالاتر ہے، بہرحال

"ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی"

قاری ولایت علی شاہ قادری کو ایک بار عالم رویا میں بشارت ہوئی کہ گویا مطلع بھوپال پر ایک آفتاب اپنی ضیا باریوں سے فضا کو منور اور قلوب کو مسخر کررہا ہے، اس کی سنہری شعاعوں سے کائنات کا ذرہ ذرہ تنویر اندوز ولایت

ہو رہا ہے۔

آنکھ کھلی اور فکر ہوئی کہ وہ آفتاب کون اور کہاں ہے؟ اسی خیال کے دوران میں دوبارہ غنودگی ہو گئی، آپ نے خود کو ایک سرسبز باغ میں پایا، جس میں ایک قصر عظیم حسین کی عظمت وجلالت بڑھا رہا تھا۔

قصر کا دروازہ مرصع اور مرتفع تھا اور اُس کے بالائی حصہ پر ایک نوجوان کھڑا تھا جس کا چہرہ انتہائی نورانی اور شکل بے انتہا حسین تھی ہاتھ میں ایک بڑا سا کاغذ تھا، دروازہ کے سامنے میدان میں ہزارہا آدمی جمع تھے اور مقدس نوجوان اُس کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے مجمع کی طرف اڑا رہا تھا مجمع کا ہر فرد فرط اشتیاق سے اُن پرزوں کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا، اور جس کو کوئی پرچہ ملجاتا وہ شاد کام ہو کر قصر میں داخل ہو جاتا۔

صاحب رویا بیان کرتے ہیں کہ میں بھی مجمع میں شریک ہو کر پرچہ حاصل کرنے کی سعی کرنے لگا، یکایک ایک پرچہ مجھے بھی دستیاب ہو گیا اور میں دروازہ کی طرف چلا، جس وقت قصر میں داخل ہونے لگا تو ایک سفید پوش شخص نے اجازت کا پروانہ طلب کیا اور میں نے وہی پرچہ پیش کر دیا پرچہ دکھا کر میں قصر میں داخل ہو گیا' پرچہ میں لکھا تھا'۔

"ناصر الدین محمدؐ اسد الرحمٰن قدسی"

میں نے قصر میں جا کر دیکھا نہ باغ ہے نہ کوئی عمارت، ایک وسیع اور عریض میدان ہے اور آفتاب اپنے پورے جلال اور دلکشی کے ساتھ منظر افروز ہے، جو لوگ مجھ سے پہلے داخل ہو چکے تھے جمال آفتاب کا نظارہ کر رہے ہیں۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ یہ آفتاب ولایت ہے اور مطلع بھوپال کو پُر نور بنانے کے لیے طلوع ہوا ہے آنکھ کھل گئی، قلب کی کچھ عجیب حالت تھی، میں اُسی دن بھوپال روانہ ہو گیا

اور اُس مہر ولایت کی جستجو شروع کردی ورود بھوپال کے دوسرے دن حضرت قبلہ مولانا مرشدنا شاہ ابو احمد صاحب نقشبندی، مجددی نور اللہ مرقدہٗ سے خواب عرض کیا، قبلہ عالم نے سُنکر سر جھکا لیا کچھ دیر خاموش رہکر ارشاد فرمایا کہ اُس مہر عالمتاب کو سبزی منڈی میں میاں محمد کے دولتکدے پر تلاش کرو، چنانچہ میں وہاں پہونچا، دیکھا کہ جاگیردار صاحب کمرے میں رونق افروز ہیں، چند عرب ، ترک اور موصوف گفتگو کر رہے ہیں اور قہوہ نوشی ہو رہی ہے، میرے ساتھ نہایت اخلاق سے پیش آئے اور میں نے اپنے مقصود جستجو کی نسبت دریافت کیا۔ فرمایا کہ وہ میرے نواسے ہیں اور ابھی مجھ سے ملکر سامنے والے مکان میں گئے ہیں۔ یوسف کہکر پکارو اگر ہونگے تو ملاقات ہو جائے گی اگر یہاں نہ ملے تو باغ فرحت افزا کی مسجد میں ملیں گے۔ وہیں اُن کا مستقل قیام ہے۔

میں مسرور ہوگیا اور بتائے ہوئے مکان پر آواز دی اندر سے جواب آیا کون ہے ؟ میں نے جواب دیا، ایک خادم جواب سُنکر ایک سادہ وضع نوجوان باہر نکلا، نظر ملتے ہی میں عالم تحیر میں رہ گیا، بار بار مجھ سے سوال ہوتا تھا کہ آپ کون ہیں اور کس کی جستجو ہے، لیکن میں محو حیرت تھا اور ان سوالات کا جواب اپنی حیران نگاہوں سے دے رہا تھا یہ نوجوان وہی تھا جسے میں نے خواب میں دیکھا تھا، میں بے تابانہ قدموں میں گر پڑا اس نیر برج ولایت نے مجھے سنبھالا، جب حواس درست ہوئے تو میں نے دست بوسی کی ارشاد ہوا آپ کون ہیں ؟ کہاں سے تشریف لائے ہیں ؟ اور کیا چاہتے ہیں ؟ میں نے اپنا خواب بیان کیا، خواب سُنکر نورانی چہرہ زرد پڑ گیا، چند منٹ خاموش رہے اس کے بعد ممدوح مہربانی کے ساتھ مجھے اپنی قیام گاہ پر لیگئے

قیامگاہ پر سر پرآرائے مسندِ ولایت کا اثاث البیت کیا تھا ایک پرانا بوریا جس کے سرہانے دو اینٹیں رکھی تھیں، ایک کمبل ایک پانی کا گھڑا اور ایک مٹی کا لوٹا۔

ظہر کا وقت ہو چکا تھا میں نے اور آپ نے نماز با جماعت ادا فرمائی، اور بکمال نوازش مجھ سے گفتگو فرماتے رہے دوران گفتگو میں ارشاد فرمایا کہ میرے دو رفیق حاجی یوسف خاں اور محمد یوسف روزانہ شام کو آتے اور میری ضروریات پوری کر جاتے ہیں ۔

میں حیران تھا کہ یہ عمر اور یہ توکل و مجاہدہ، شام تک حضرت کی خدمت میں حاضر رہا، مغرب کے قریب وہی دو نو حضرات کچھ خرمے اور چائے لیکر حاضر ہوئے، حضرت نے روزہ افطار فرما کر چائے نوش فرمائی اور ہم لوگوں کو رخصت کر دیا، راستہ میں مجھے ہمراہیوں سے معلوم ہوا کہ حضرت مخدوم اکثر راتیں عبادت الٰہی میں کھڑے کھڑے گزار دیتے ہیں اور ہمیشہ پائے اقدس اور آنکھوں کو متورم دیکھا گیا ہے دوسرے روز صبح آٹھ بجے کے قریب میں پھر حاضر ہوا حضرت اقدس آرام فرماتے تھے، میں نے قدمبوسی حاصل کی اور آہستہ آہستہ تلوے سہلانے لگا، پائے مبارک کو متورم دیکھکر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، چند منٹ کے بعد آپ بیدار ہوئے اور مجھ سے مزاج پرسی فرمائی، نماز ظہر تک حاضر خدمت رہا، گفتگو کیا تھی حقائق و معارف کا ایک دفتر تھا، ظہر کے بعد حضرت کی اجازت سے کچھ سامان لینے شہر آگیا اور پھر فوراً ہی حضوری میں واپس ہو گیا، قریب مغرب وہی دو نو حضرات چائے اور خرمے لیکر حاضر ہوئے، افطار کے بعد ہم لوگ شہر واپس ہو گئے اور حضرت بدستور عبادت الٰہی میں مصروف۔

میں ایک ہفتہ حاضر خدمت رہا اور حضرت کے معمولات میں کبھی کوئی فرق نہیں دیکھا وہی شب بیداری اور وہی روزہ، ایک ہفتہ کے بعد میں نے رخصت کی استدعا کی، بکمال شفقت پیرہن مبارک مجھے عطا فرمایا گیا اور میں زار و قطار واپس روانہ ہوا۔

سیاحت

مسجد باغ فرحت افزا میں تقریباً ڈھائی برس قیام فرمایا، اس عرصہ میں بہت لوگ فیوض و برکات سے شرف اندوز ہوئے، حضرت اقدس اپنے متوسلین اور حلقہ بگوشوں کی روحانی و باطنی تعلیم وتلقین کے ساتھ ساتھ ظاہری اصلاح بھی فرماتے رہے چنانچہ بہت سی رسوم جو خلاف سنت رائج تھیں اپنے وابستگان سے ترک کرادیں۔ اسی طرح جب فرحت افزا کا قیام ترک کر کے سیر و سیاحت شروع کی تو ہر جگہ اور ہر موقعہ پر اصلاح قوم کو ضروری سمجھا۔ تقریباً پانچ سال برابر سفر میں گذرے سارے ہندوستان کا گشت لگایا اور بیرون ہند اکثر جزائر کا سفر کیا ہر جگہ کی مخلوق داخل سلسلہ ہو کر فیضیاب ہوئی اور ہر جگہ روحانی تعلیمات کے ساتھ ظاہری اصلاح کی سعی فرماتے رہے۔

آپ کی زندگی کا یہ ایک زرین کارنامہ ہے کہ اپنے حلقہ اثر میں علاوہ انسداد رسوم غیر شرعی آپس میں اتحادی روح دوڑادی اور واعتصمو بحبل اللہ جمیعاً کی موعظت سے اپنے تمام سلسلے کو متاثر کر دیا۔ آپ کی مقدس زندگی کا دوسرا بزرگ ترین کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے اصلی طریقت اسلامیہ کو جو بہت سے مذاہب ومشارب کا صدیوں سے مجموعہ تھی اس طرح علٰحدہ کرلیا ہی، جیسے ایک ماہر فن ست کٹ دہات سے سونا الگ نکال لیتا ہی۔

آپ نے وہ تمام عقائد جو براہمہ واشراقیین سے لئے گئے تھے اور وہ تمام اعمال جو یوگ اور رہبانیت سے ملحق تھے، خارج کر دیئے اور کامل تحقیق کے ساتھ علمی و عملی حیثیت سے کھرے کھوٹے کو پرکھ دیا۔ آپ نے اپنے آپ کو ایک نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا ہی اور دکھایا ہی کہ حقیقتاً درویشی کی صحیح تعریف

کیا ہے اور کس طرح ایک شخص دنیا میں رہکر تارک الدنیا ہو سکتا ہے۔

عقائد

عقائد کو مذہب کے اصول اساسی کا اصطلاحی نام کہہ سکتے ہیں، اس لیے کہ مذہب کی بنیاد صرف عقائد پر ہے، اعمال و عبادات سب عقائد کا حاصل و نتیجہ ہیں، کوئی شخص محض طریقہ عبادت کی نقل سے اُس مذہب کا حقیقی معنوں میں پیرو نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ مذہبی پیروی و تقلید کے لیے شرط اول عقائد ہیں، عقائد دو قسم کے ہوتے ہیں، اصولی و فروعی، اصولی عقائد کا دوسرا نام راس العقائد بھی ہے اسلام میں جن عقائد پر ایمان کا دار و مدار ہے وہ تو نا قابل تعریف ہیں اور کبھی، کسی قسم کا تغیر اُن میں پیدا نہیں کیا جا سکتا، اون کا تبدیل کرنے والا قطعاً کافر ہے۔

البتہ وہ عقائد جو فروعی ہیں، یعنی جن کا اصولی باتوں سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اکثر مجددین اور مجتہدین کے نتائج تحقیقات کی وجہ سے مختلف فیہ ہیں، مگر یہ اختلاف مذہب کے واسطے باعث خیر و برکت ہے۔

عقائد تصوف میں بھی اس قسم کے اختلافات موجود ہیں، ہمیں اس سے بحث نہیں کہ متقدین کہاں تک بر سر صحت ہیں اس لیے کہ یہ تو اپنا اپنا علم اپنی اپنی تحقیق ہے۔ بہر حال ایک محتاط سالک کو وہی راستہ اختیار کرنا چاہئے جو ان اختلافات سے پاک ہو۔

حضرت ہمہ اوست، کے قائل نہیں، ہمہ از وست، کو بھی غیر ضروری خیال فرماتے ہیں، آپ کے نزدیک وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بحث بے ادبی اور گستاخی

ہے، ہر چند کہ علم الکلام کی خوبی و فضیلت اظہر من الشمس ہے، مگر آپ اسکو بیکار مشغلہ تصور فرماتے ہیں۔ حضرت کے نزدیک علم الکلام جو منطق و فلسفہ سے مشترک اور ظنیات و قیاسات پر مشتمل ہے، العلم حجاب الاکبر کا مصداق ہے آپ کے نزدیک ہر مومن کو، یؤمنون بالغیب کے زمرے میں داخل ہونا چاہئے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ وہ امورِ غیبیہ جن کا ادراک محُال ہے، اُن کے متعلق بحث کرنا گستاخانہ جرأت ہے خدا نے اپنے کلام میں جو کچھ فرمایا ہے اور جو کچھ بھی اُس کی مُراد ہے اُسی پر بغیر چون و چرا اور ردو قدح ایمان لانا ضروری ہے نیز رسولؐ خدا کے ارشادات پر بھی، اُسی مراد کے مطابق جو حضور انور نے لی ہے، بغیر پس و پیش کے یقین کرنا لازمی ہے اگر انسان مرجائے اور وہ علم الکلام کی حقیقت و ماہیت اور اصلاح، جوہر، و عرض، و جسم وغیرہ سے، واقف نہ ہو تو خدا تعالےٰ اُس سے یہ سوال نہ فرمائے گا کہ تو نے علم الکلام حاصل کیا یا نہیں، بلکہ وہی پوچھا جائیگا، جو تکلفات شرعیہ اُس پر واجب کئے گئے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ خدا نے اپنے بندوں پر کتاب حکیم میں جتنی باتیں فرض کی ہیں، یا رسول خدا نے جن امور کو واجب کیا ہے، اُن سب کی پیروی ہر بالغ و عاقل انسان پر لازمی ہے ایمان نام ہے، قول، عمل اور نیت کے مجموعے کا، ایمان کی جڑ یہ ہے کہ زبان سے اقرار کیا جائے اور دل سے اُسے سچا مانا جائے۔ اور فرائض و واجبات پر بخلوص کامل عمل کیا جائے۔ اعمال حسنہ کا مدار عقائد کی صحت پر ہے، آپ فرماتے ہیں کہ ایسے اعمال اختیار کئے جائیں جو کامل احتیاط کے ساتھ متحقق و مستند ہوں، اس بات کو نہ دیکھا جائے کہ فقہا نے ان اعمال کے بارے میں اختلاف کیا ہے یا متفق ہیں۔ فقہا کا اختلاف رائے راستی پر مبنی ہے، جو اپنی اپنی تحقیق کی بنا پر واقع ہے،

مذاہب اربعہ اہل سنت حق پر ہیں اُن کی اتباع کیجائے جمود تقلید سے بصارت

اندھی ہوتی ہے، چاروں کی پیروی جبکہ وہ حق پر ہیں ضروری ہے۔ جو بات اپنے اجتہاد اور اپنی دانست میں زیادہ مستند اور آسان معلوم ہو اُسی کو اختیار کرنا چاہیئے، کیونکہ رسول خدا کا ارشاد ہی۔ "انّ خیر دینکم الیسرہ"

تحقیقات

حضرت کا ارشاد ہی کہ یہ طریقت و تصوف جو آج مروج ہے، اسلام سے علحدہ ایک چیز ہے۔ طریقت اسلامیہ عین شریعت اسلامیہ ہی، یہ مصطلحات و اعمال کی بہتات غیر مذاہب سے اخذ کی گئی ہے، جو واجب العمل نہیں۔ خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ جو بات اچھی یا بُری کسی دوسرے مذہب کی اختیار کروگے وہ ہرگز مقبول نہ ہوگی۔

کتاب العقائد میں، حضرت نے اسلامی عقائد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہی کہ تصوف میں کون سے عقائد آج ایسے موجود ہیں، جو غیر مذاہب کے ہیں اور اسلام سے متعلق نہیں، اسی طرح اعمال کے بارے میں بحث فرمائی ہے اور اصل کو نقل سے الگ کیا ہے۔

کتاب حقائق الاشیاء میں، حضرت نے علم الکلام اور فلسفہ و تصوف کے خلاف اپنے مکشوفات و مشہودات بیان فرمائے ہیں جو قابل دید ہیں۔

البیان فی رد البطلان میں آپ نے اُن تمام سربستہ رازوں کو کھولا ہی، جو علم سینہ کے نام سے موسوم تھے اور جن کو سینہ بسینہ منتقل کیا جاتا تھا، غرضکہ آپ کی تحقیقات مکمل ہے۔

طریقہ

حضرت کو اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے گو چاروں خاندانوں کی اجازت ہی، مگر آپ کا اصل طریقہ ناصریہ ہے، جو سلطان الطریقت امام الاولیاء ناصر الملت والحق سیدنا حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ، سے منسوب ہے۔ اور بھی بہت سے خانوادوں میں آپ کو اکثر مشائخ عظام سے اختیار و مجاز حاصل ہے لیکن زیادہ تر آپ اسی سلسلہ میں لوگوں کو داخل فرماتے ہیں۔

سجادہ نشینی

۱۱ رجب سنہ ۱۳۴۳ھ دولت اسلامیہ بھوپال کی تاریخ میں ایک مقدس ترین اور یادگار دن ہے، جس کا تذکرہ نورانی حروف میں اوراق قلب پر نہ مٹنے والے خط میں لکھنا چاہئے،، اللہ اللہ کیا دن تھا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تمام عالم کی فضا پر انوار و برکات کا نزول ہو رہا ہے۔ کیوں نہ ہو کہ ایک شہسوار میدان عرفان حقیقت شہبازِ اوج تفرید، شناور دریائے معرفت اپنی دوازدہ سالہ جد و جہد اور لگاتار رہروی کے بعد، سنگلاخ زمینوں اور خارزار میدانوں کو طے کر کے منزل مقصود کو پہونچ رہا ہے۔

حلقہ بگوشان سلسلۂ ناصریہ و وابستگان آستانہ کی روحانی مسرتوں کی کوئی حد نہ تھی۔ ارادت مندوں نے بڑا شاندار جشن منایا منجانب نوابزادہ والا رتبت رشید الملۃ والدین محمد رشید الظفر خاں بہادر آستانہ مبارک کے میدان میں شاندار شامیانے نصب کئے گئے اور آستانہ پر ایک سبز پرچم لگایا گیا، وسط فرش پر سجادہ

محترم کو زنیت دی گئی بعد نماز عصر حضرت اقدس حجرۂ شریف سے برآمد ہوئے یا یوں کہیئے کہ آفتاب ولایت طلوع ہوا، غرضکہ سب حاضرین تعظیم بجالائے اور حضور دام ظلہم ایک زعفرانی چہانٹی کا احرام زیب تن کئے ہوئے سجادہ پر رونق افروز ہوئے، پشت پر فقرا، صلحا، کی جماعت تھی، دہنی طرف نوابزادگان والاشان رؤسائے شہر، بائیں طرف حکام ملک و عمائدین شہر اور سامنے عوام الناس کی صفیں تھیں۔ پشت پر میاںجی نور علی شاہ بابا چنور اُڑا رہے تھے، جلسہ کا افتتاح خود حضور اقدس مدفیضہم نے فاتحہ سے فرمایا۔

اس کے بعد ضیاء الملک مولانا حافظ محمد صدیق توحیدی نے ایک بلیغ تقریر جلسہ کے متعلق فرمائی، اور بدر الشعرا حافظ محمد منیر الدین احمد نے حضور اقدس دام فیضہم کا فرمان پڑھکر سُنایا۔ شعرا نے قطعات و قصائد پیش کئے نواب زادہ والا قدر محمد سعید الظفر خاں بہادر ناصر جنگ اور عالی وقار ناصر الملتہ نوابزادہ رشید الظفر خاں بہادر نے دست بوس ہوکر اپنے مرشد طریقت کو پھول پہنائے، اس کے بعد دبیر الملک امیر الامرا سر اسرار حسن خاں بہادر مشیر المہام نے شرف دستبوسی حاصل کیا، ازاں بعد یکے بعد دیگرے عقیدت مندوں نے دست بوسی کا شرف حاصل کیا۔

حضرت اقدس کی جانب سے تبرکات، خطابات، انعامات عطا فرمائے گئے جن کی تفصیل ہندوستان کے اکثر اخبارات میں شائع ہو چکی ہے علیا حضرت سرکار عالیہ دام اقبالہا کو بہ سبب اُس عقیدت و محبت کے جو ممدوحہ کو حضرت اقدس سے ہے، خاص طور پر وہ تسبیح عطا فرمائی گئی جس پر حضرت ورد فرمایا کرتے تھے۔ والا قدر نوابزادہ رشید الظفر خاں بہادر کو تلاوت خاص کا وہ قرآن کریم جو سید ناجعفر مکی قدس سرہ کا قلمی ہے، عطا فرمایا گیا۔ دیرینہ خدام اکثر عطیات سے سرفراز فرمائے گئے۔

تصرفات

سجادہ نشینی سے قبل ہر گوشۂ ملک کے تقریباً چالیس ہزار افراد حلقہ ارادت میں داخل ہو چکے تھے۔

حضرت اقدس کا طریقۂ رشد و ہدایت بالکل سنت صحیحہ کے مطابق ہے آپ کی تعلیمات عین قرآنی تعلیمات ہیں آپ کی مبارک زندگی اور آپ کا طرزِ عمل ایک روشن سبق ہے، جس سے عملی درس معرفت مل رہا ہے۔ آپ نے ایسے ایسے لوگوں کی اصلاح فرمائی ہے جن کی نسبت عام خیال تھا کہ یہ کبھی راہِ راست پر نہیں آئیں گے۔ آپ نے بکثرت لوگوں کی بُری عادتیں اپنے تصرف اور اپنی ہمتہ باطنی سے چھڑا دیں اور بہت سالکان طریقت کے باطنی مراحل اپنے تصرف سے طے کرا دئے۔ چنانچہ حضرت مولانا فضل احمد کشمیری جو ایک متبحر عالم ہیں سالہا سال سے کسی روحانی کشمکش میں مبتلا تھے حضرت اقدس کی خدمت میں حاضر ہو کر فیضیاب ہوئے اور اُن کی ذات سے آج ہزارہا مخلوق فیض پا رہی ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب نقشبندی سندیلوی ایک معمر بزرگ ہیں اور شیخ وقت مانے جاتے ہیں حضرت اقدس ہی کے فیضیافتہ ہیں۔ حضرت مولانا رفیع الدہلوی بھی حضرت اقدس کی نظر فیض اثر کے تربیت یافتہ ہیں جن کا وجود آج بنگال و مدراس کی مخلوق کے لئے باعث صد برکت بنا ہوا ہے، حضرت مولانا عبدالعزیز، حضرت شاہ سلام اللہ اورنگ آبادی، سید ابن علی، صوفی کاشف شاہ دہلوی، پیر تراب علی شاہ گوالیاری، اور شاہ محمدؒ عارف صاحب وغیرہ یہ سب حضرت اقدس ہی کے حلقہ بگوش ہیں اور خدمت بابرکت میں رہکر اکتساب فیض کیا ہے اسی

طرح اور بہت سے ارباب ذوق وطالبان حق کسب ضیاء کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔

دنیوی امور میں بھی اپنے مفید مشوروں سے ارادت مندوں کی رہبری فرماتے ہیں، وابستگان کی حاجات کے لیئے دعا فرماتے ہیں اور آپ کی مقبول دعاؤں کی برکت سے مخلوق کے کام بن جاتے ہیں غرض حضرت اقدس کی ذات ایک گنجینۂ فیض و برکت ہے۔ جو لوگ آپ کے سلسلے میں داخل ہیں ان میں سے بیشتر افراد آج اپنی زندگیوں میں ایک نمایاں تبدیلی اور اپنے حالات میں غیر معمولی تغیر پاتے ہیں جو حضرت اقدس کے تصرفات کا نتیجہ ہے۔

حلقہ بگوشوں میں مقلد، غیر مقلد، اور شیعہ، سنی غرض ہر فرقہ کے لوگ داخل ہیں، حضرت اقدس کی ہمتہ باطنی نے ان سب میں اخوت ومساوات کی روح پھونکدی ہے اور اُنس وارتباط کے شیرازہ میں منسلک کر دیا ہے، جو آپ کی روحانی قوت کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے، طریق تعلیم کچھ ایسا دلنشیں ہوتا ہے کہ کامل اصلاح ہو جاتی ہے۔

یہ ایک تلخ لیکن عریاں حقیقت ہے کہ ہمارا زمانہ " مادہ پرستی " کا زمانہ ہے، اذہان وعقول ہر اُس واقعہ کے بطلان وانکار پر کمربستہ رہتے ہیں جو عام حالات سے کسی قدر مختلف اور ادراک انسانی کے دائرہ اقتدار سے باہر ہو۔ چنانچہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ میں ۹۰ فیصدی ایسی ہستیاں پائی جائیں گی جو اولیاء و مشائخ کے باطنی تصرفات کو شعبدہ گری وابلہ فریبی سے زیادہ کوئی وقعت دینے کے لیے تیار نہیں، لیکن جہاں سیکڑوں دماغ روحانیت کے ابطال میں مصروف ہیں وہیں ایک کثیر تعداد اُن لوگوں کی بھی ہے جو سائنس ہی کی مدد سے روحانیت کے اثبات میں ہمہ تن مصروف ومنہمک ہیں، مشرق کو چھو۔

کرجو "توہم پرست" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے آج مغرب کی اُس سرزمین میں
جہاں کلیتہً مادیت و لامذہبیت کی حکومت ہے اور جہاں کی فضائیں فلسفہ و
علوم عقلی کی عطر بیزیوں سے مہک رہی ہیں ایسے اصحاب کی کمی نہیں جو "بقائے
روح" "اقتدار روح" وغیرہ مسائل پر آئے دن قلم فرسائی کرتے رہتے ہیں۔
یہی نہیں بلکہ اپنے مقاصد میں بڑی حد تک کامیابی ہو چکی ہے، وہ ارواح کی
تصاویر لے سکتے ہیں، اُن سے گفتگو کر سکتے ہیں اور اُن کے ذریعہ نظام عالم
میں تصرف کے مدعی ہیں۔

آپ کی حیرت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جب آپ یہ معلوم کریں کہ آج یورپ
میں ۳۰۰ سے زیادہ باقاعدہ انجمنیں ایسی ہیں جن کا مطمح نظر صرف روح اور روحانیت
ہے۔ یہ سب باہم ملکر کام کرتی ہیں ان کے اراکین کی تعداد تیس لاکھ نفوس
تک پہنچتی ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے اشخاص بھی ہیں جو تنہا اپنے طور پر
تحقیقات میں مصروف ہیں۔

اس سے قطع نظر کرتے ہوئے مسمریزم کے کرشمے تو ایسے عام ہو چکے ہیں
کہ ہم میں سے تقریباً ہر فرد ان کا بنفس معائنہ کر کے حیرت بکنار ہو چکا ہے۔ پھر کیا ایسے
حالات و شواہد کی موجودگی میں جبکہ ایک طرف مشرقی روایات ان محیر العقول
اور فوق الفطرت کارناموں کو تسلیم کر لینے کی دعوت دیتی ہیں اور دوسری طرف
مغرب وہ مغرب جس سے ہم اذواق و امیال کی بھیک مانگنا فخر سمجھتے ہیں، ان کی
تصدیق کے لیے تیار ہے، کونسا ایسا مانع موجود ہے کہ ہم اولیاء و اصفیاء کی روحانی
طاقتوں کا اعتراف نہ کریں۔

لیکن، باوجود ایسے قوی دلائل کی موجودگی کے ہم کو افسوس کے ساتھ اعتراف
کرنا پڑتا ہے کہ مغربی تعلیم کی غلط اثر پذیری کے تحت میں مشرق اور خصوصاً ہندوستان

میں مادہ پرست و لامذہب افراد کی تعداد روز بروز ترقی پذیر ہے، اس لیئے ان گم کردہ راہ بھائیوں کی اصلاح و رہبری کا طریقہ صرف یہ ہوسکتا ہے کہ بزرگانِ ملت وہادیانِ طریقت کا صحیح "اسوۂ حسنہ" قوم کے سامنے پیش کرکے اس سے انصاف طلب ہوں کہ آیا ایسی برگزیدہ ہستیوں کے حالات و واردات میں کوئی تصنع ممکن ہے اگر نہیں (اور یقیناً نہیں) تو ہمیں آج ہی سے اس سابقہ بے اعتماد زندگی سے روگرداں ہوکر مذہب و روحانیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیئے۔ اور کسی خدا رسیدہ کے دستِ حق پرست پر توبہ کرکے کسب فیض کرنا چاہیئے۔

بیعت

بیعت کے دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ جس سلسلہ میں بیعت کیجائے اُس سلسلہ کے تمام اولیاء اللہ کی روحانیت تصرف کرتی ہے، دوسرے جس شیخ کے ہاتھ پر بیعت کیجائے اُس کا تصرف دستگیری کرتا ہے۔ بیعت سے ایک واسطہ پیدا ہوجاتا ہے جو رہگذرِ مجاز سے منزلِ حقیقت تک بآسانی پہونچا دیتا ہے اور جو دشواریاں راہ کی ہوتی ہیں اُن سے شیخ باخبر کردیتا ہے۔

جس طرح صحت جسمانی قایم رکھنے کے لیے ورزش اور اصول حفظانِ صحت کی پابندی ضروری ہے، اسی طرح صحت باطنی قایم رکھنے اور پاکیزہ اخلاق حاصل کرنے کے لیے مجاہدہ ضروری ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (والشمس) — اس نے فلاح پائی جس نے تزکیہ نفس کیا اور گمراہ ہوا جس نے اپنے نفس کو بگاڑ دیا۔

مجاہدہ کی ابتدا توبہ سے ہوتی ہے، اور صحیح توبہ وہ ہے جو کسی خدا رسیدہ کے دست

حق پرست پر ہو۔

وجائی بالنبین والشھداء وقضی بینھم بالحق وھم لا یظلمون۔	گواہ اور پیغمبر حاضر کئے جائیں گے اور لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائیگا۔

طریقہ کا عام دستور

جب کوئی حضرت اقدس کے سلسلہ میں داخل ہوتا ہے اس سے پہلے توبہ کراتے ہیں پھر حسب ذیل امور تلقین فرماتے ہیں :۔

" طریقت کا دار و مدار دو باتوں پر ہے۔ نیکی، اور محبت، نیکی یہ ہے کہ تم مخلوق کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو اُن سے اپنے حق میں پسند کرتے ہو، حدیث شریف میں آیا ہے کہ آدمی اُس وقت کامل ہوتا ہے جبکہ وہ تمام مخلوق کے لیے وہی بات پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ خدمت خلق کے یہی معنی ہیں۔

محبت کے معنی یہ ہیں کہ اپنی سب خواہشوں کو خدا کے احکام پر قربان کردو،

محبت کے تین بڑے رکن ہیں۔

عبودیت ، اخلاص ، توکل

عبودیت کے تین مرتبہ ہیں :۔ اول یہ کہ احکام شریعت کا اس درجہ سحاظ رکھنا کہ تمہارا کوئی کام یا کوئی حرکت وسکون بھی خلاف حکم خدا و رسول نہ ہونے پائے دوم یہ کہ قضا و قدر اور قسمت خداوندی پر راضی ہونا، سوم یہ کہ اپنے اختیار وخواہش کو خدا تعالےٰ کے اختیار وخواہش پر چھوڑ دینا۔

اخلاص یہ ہے کہ تمہارے سب کام خاص خدائے پاک کے واسطے ہوں، جو کام بھی تم کرو اُس میں تمہارا دل مخلوق کی طرف اور مخلوق کی مدح وثنا کی طرف ذرا

بھی مائل نہ ہو۔

توکّل یہ ہے کہ تم کو خدائے پاک کے وعدوں پر وثوق کامل اور یقین کلی پیدا ہو جائے کہ جو چیز تمہاری قسمت میں ہے وہ ضرور تم کو ملے گی اگرچہ سارا جہان اس کے خلاف ہو جائے، اور جو چیز تمہارے مقسوم میں نہیں ہے وہ تم کو کبھی ہرگز نہیں مل سکتی خواہ سارا جہان تمہارے ساتھ مل کر کوشش کرے۔

مقصود طریقت صرف یہ ہے کہ دل گرفتاری ماسوی اللہ سے آزاد ہو کر حضور وشہود حق سے آباد ہو جائے اور یہ بات اُس وقت نصیب ہوتی ہے جب تمام خصائل ذمیمہ و اوصاف رذیلہ فنا ہو کر اُن کی جگہ صفات جمیلہ و اخلاق حسنہ پیدا ہوں"۔

کتنی مختصر اور جامع تعلیم ہے اور پھر کس قدر توحید میں ڈوبی ہوئی ہدایت ہے، یہ ہدایت صرف رسمی یا لفظی ہی نہیں ہوتی بلکہ اپنے تصرف سے اِن امور کو دل نشیں فرما دیتے ہیں اور خود بھی چونکہ ان امور پر کامل طور سے عمل پیرا ہیں اس لیے اپنے طرز عمل سے عملی درس بھی دیتے ہیں حقیقت میں حضرت اقدس کی مبارک زندگی طریقت کا ایک دفتر ہے جس میں معرفت حق کے نہایت روشن سبق ہیں۔

اخلاق وعادات

کسی شخص کے اخلاق سے بحث کرنا، اصل میں اُس کے نفس کی اُن باطنی خوبیوں کو نمایاں کرنا ہے جو فطرتاً اور اکتساباً اُس کی ذات کا جزو بن گئی ہیں، اخلاق بعلم حکمت کی رو سے طبعی ہیں اور اسی لیے وہ ناقابل تغیر کہے جاتے ہیں، لیکن بہ نظر تعمق اگر دیکھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ بعض اخلاق تابع مزاج ہیں اور بعض مزاولت

و ممارست فعل سے طبیعت میں راسخ ہو گئے ہیں اور اُن کا صدور بے تامل و تفکر ہوتا رہتا ہے اور اسی کو خلق یا عادت کہتے ہیں علم نفسیات کے اصول سے اگر فلسفۂ اخلاق پر غور کیا جائے تو تمام اخلاق فطری نظر آئیں گے، ہم ان تمام اختلافات سے قطع نظر کر کے حقیقت اور غایت اخلاق سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

نفس کا ذمایم، رذائل اور معائب سے قولاً، فعلاً، خیالاً پاکیزہ اور بے لوث ہونا، اخلاق حسنہ کا مترادف ہے، بہت ممکن ہے کہ ایک شخص قولاً و فعلاً بہترین نمونہ اخلاق ہو لیکن خیالاً وہ صاف باطن نہ ہو، تو ایسا شخص معلم اخلاق کے نزدیک کبھی بھی بہ نظر استحسان نہیں دیکھا جا سکتا، بلکہ وہ اُس شخص سے بھی بدتر ہے جو قطعاً بداخلاق ہے اور علانیہ اخلاق سیئہ پر عامل ہے، اس لیے کہ عالم اخلاق کے نزدیک خیالات کی صفائی وہ چیز ہے، جس پر تمام نظام اخلاق کا دار و مدار ہے۔

پاکیزگی خیال ہی وہ صفت ہے جس سے تمام اخلاق حسنہ اور فضائل ملکیہ پیدا ہوتے ہیں۔ اخلاق کی چار بڑی قسمیں ہو سکتی ہیں،

نمبر ۱۔ وہ اخلاق جن کا اثر اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے اور جن کی ممارست سے انسان قوائے بہیمیہ اور خواہشات نفسانیہ کو مغلوب کر دیتا ہے، اور وہ قناعت، صبر، توکل، ضبط نفس اور شجاعت جیسے جذبات شریفہ اور اخلاق پسندیدہ ہیں۔

نمبر ۲۔ وہ اخلاق جن کا تعلق وابستگان ذات اور متعلقین سے ہے، اور ارتباط باہمی، حق شناسی، صلہ رحمی، اور ادائے فرض جیسے رابطوں کی تکوین کرتے ہیں، اس قسم میں محبت، شفقت، الفت، انصاف وغیرہ جیسے جذبات لطیفہ شامل ہیں،۔

نمبر ۳۔ وہ اخلاق جن کا حلقۂ اثر، تمام بنی نوع انسان اور مخلوقات تک

پھیلا ہوا ہے، اس میں رحم، ہمدردی، سخاوت، ایثار، وغیرہ تمام جذباتِ عالیہ موجود ہیں۔

نمبر ۲:- وہ اخلاق و عادات جن سے وجود انسانی کے قیام اور بقا کا تعلق ہے اور اپنی شخصیت، عزت، حرمت کا تحفظ مقصود ہے مثلاً شہوت، غضب، خودداری بے نیازی، اولوالعزمی وغیرہ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جذبات کا اعتدال و عدم اعتدال ہی دُنیائے اخلاق و عادات پر حکومت کر رہا ہے، اگرچہ نفسیاتی طریقہ تحقیق سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اخلاق چونکہ فطری ہیں اس لئے جذبات سے متاثر نہ نہیں کئے جا سکتے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اخلاق و عادات جذبات کا عملاً، فعلاً یا آثاراً ظہور ہے، خود جذبات، اخلاق نہیں کہے جا سکتے۔ مذہب اسلام نے جس اخلاق کو دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے اُس کی مثال دوسری اقوام میں نہیں پائی جاتی،

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق ایسا جامع اور مکمل تھا کہ تمام عالم آج تک حیران و ششدر ہے، اخلاق کا حقیقی معیار یہ ہے کہ ہر لوث و غرض سے پاک اور صرف خدائے برتر کی خوشنودی اور رضاجوئی کے لیے ہو، کوئی شخص جب تک حُسنِ اخلاق میں سرکار دو عالم کا، قولاً و فعلاً تبع نہ ہو ہرگز درویش نہیں بن سکتا، جس شخص کے اخلاق میں ذرا بھی خامی ہے، اُس کی درویشی مکمل نہیں جس درویش کا خداوند عالم سے جتنا گہرا اور سچا تعلق ہوگا، اُس میں یہ حسن اُسی قدر نمایاں ہوگا۔

ہم دعوے سے کہیں گے کہ ہمارے حضرت "تخلقو باخلاق اللہ" کا مکمل نمونہ ہیں۔

انسان فطرتاً مجبور ہے کہ وہ دوست و دشمن میں امتیاز کرے، لیکن حضرت اقدس کی نگاہ کرم دونو پر یکساں ہے، آپ کی خدمت میں ایسے لوگ بھی آتے ہیں، جن کا مقصد صرف حصول دنیا ہوتا ہے، اور پھر اپنی عقیدت مندی اور ارادت کیشی کا ثبوت اس طریقہ سے دیتے ہیں، گویا کہ ان سے زیادہ حضرت کا کوئی معتقد نہیں، آپ

ایسے اشخاص سے احتراز کرنے کی کوشش فرماتے ہیں، لیکن حسن اخلاق کہ اُن لوگوں کی گفتگو بھی مخصوص توجہ کے ساتھ سنتے ہیں۔

اثر صحبت کلیہ ہے کہ ہم مذاق اشخاص کی صحبت باعث دلبستگی و راحت ہوتی ہے، لیکن آپ کی صحبت میں، بچہ، جوان، بوڑھا بغیر امتیاز مذہب خوش رہتا ہی، بارہا دیکھا گیا ہی کہ چھوٹے چھوٹے بچے، جن کا میلان فطرتاً کھیل کود کی طرف ہوتا ہے، گھنٹوں متین اور سنجیدہ لوگوں کی طرح مؤدب بیٹھے رہتے ہیں۔

آپ کی صحبت میں تھوڑے ہی دن کے بعد، انسان کا دل خرافات سے بیزار اور طاعت وعبادت کی طرف مائل ہو جاتا ہے، افعال ذمیمہ، اخلاق جمیلہ سے بدلجاتے ہیں طبیعت میں استقلال و یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے، اور خالص اسلامی جذبات، مروت، ہمدردی، ایثار نیکی، پرہیزگاری پیدا ہو جاتے ہیں۔

یہ بالکل واقعہ اور خدا کی رحمت ہے کہ آپ کی صحبت میں اگر خلوص دل سے کوئی شخص چند روز اکتساب فیض کرلے تو بغیر کسی ریاضت و مجاہدے کے اتنا کمال حاصل ہو جاتا ہے، جو برسوں کی محنت شاقہ میں بھی حاصل نہیں ہوسکتا، بیش از بیش علمی نکات، عقائد، اعمال، عبادات غرضکہ، زندگی کا ہر شعبہ سنور جاتا ہے، ایسے ہی پاکیزہ نفوس کے لیے مولانا روم نے فرمایا ہے۔

یک زمانہ صحبتِ با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

آپ کی مقدس و محترم ہستی سرمایہ تسکین و راحت ہے جس سے ہر مضطرب قلب اطمینان حاصل کرسکتا ہے۔ چنانچہ ہزارہا آدمی شاہد ہیں کہ جب افکار

وآلام کا ہجوم دل میں لیکر خدمت مبارک میں حاضر ہوئے ایک فوری تسکین محسوس ہوئی اور تمام فکر و الم کافور ہوگئے حتیٰ کہ دکھ درد کی ظاہری تکالیف بھی آپ کی نظر فیض اثر سے دور ہوجاتی ہیں۔ نواب محسن الملک بہادر (فردوس مکان) نے بارہا اپنی سخت ترین علالت کے زمانہ میں فرمایا کہ جس وقت حضرت اقدس تشریف لاکر میرے سینہ پر دست مبارک رکھتے ہیں مجھے ایک فوری تسکین محسوس ہوتی ہے جس کا عرصہ تک اثر رہتا ہے اور صحت کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔

ایثار اس میں شک نہیں کہ بلحاظ "تخلقو باخلاق اللہ" انسان کی تکمیل اُن تمامی اخلاق سے متصف ہونے پر منحصر ہے جو صفات الٰہیہ میں داخل ہیں اور درویش کے لیے نفس شکنی اور ریاضت کے لیے بمنزلہ صیقل ہیں۔ تزکیہ باطن ان کے بغیر ممکن ہی نہیں اور ملکات حسنہ کا پیدا ہونا قطعاً انہی پر موقوف ہے۔

ایثار کی تعریف یوں کیجاتی ہے کہ سب کے بعد خود سے محبت کرنا، یعنی دوسروں کے مفاد کو اپنے ذاتی فوائد پر مقدم سمجھنا، اس کا صحیح مصداق وہ انسان ہوسکتا ہے جو باوجود بے مایہ ہونے کے دوسرے حاجتمندوں کی ضروریات، اپنے مایۂ مرغوب سے، اگرچہ وہ اُسی کی ضروریات زندگی کے لیے کافی نہ ہو، پوری کرے جیسا کہ فقراً مہاجرین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان فقر ہیں، قرآن حکیم نے فرمایا ہے۔ "وَیُؤثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ"

یہ وہ سخت اور قریب قریب ناممکن العمل مجاہدہ ہے جس پر فائز ہونا بجز ملکوتی صفات انسان کے اور کسی سے ممکن نہیں، ہاں شان مہاجرین اور اصحاب صفہ کا حوصلۂ باطنی ان صفات کا آئینہ تھا، کہ سفر ہجرت، تقریب مواخات میں اس کی نورانی شعاعیں اس خاکدان عالم پر پرتو فگن ہوئیں، جن کی تجلیات ہنوز کہیں کہیں صفحات تاریخ میں نظر آتی ہیں۔ گویا ایک حقیقت تھی جس کا اثر آثار میں باقی رہا الحمدللہ کہ اُس کی زندہ

مثال بلکہ تمثال مجسم سراپائے حضرت اقدس میں نظر آتی ہے۔ دل ہے تو غنی نظر ہے تو چشمۂ لطف و رحمت، ہاتھ ہیں تو ابر کرم سینہ ہے تو سینائے انوار قدس، غرض آپ کا وجود سراپا جود ایک سرسبز و شاداب نہال ہے جس کی سایہ گستری، گل افشانی، ثمر باری، سدا بہار نظر آتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت کے پاس پہننے کے کپڑے بالکل ختم ہو گئے یہاں تک کہ جسم اطہر پر صرف ایک جوڑا رہ گیا، آپ نے بازار سے کچھ کپڑا منگایا، ابھی کپڑا آیا ہی تھا کہ ایک شخص حاضر ہوا، اور اپنی مشکلات دنیوی کا اظہار کیا، حضرت نے وہ تمام کپڑا جو ابھی آیا تھا اُسے مرحمت فرما دیا۔

ایک عرب خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ طلب کیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ فقیر کے پاس بجز دعا کے اور کیا ہے، عرب خاموش ہو گیا اور مایوسی کے آثار چہرے سے ظاہر ہونے لگے آپ نے اُسے متاثر دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ آستانے میں جسقدر بھی سامان ہے میں نے تم کو دیا، اسے لیجاؤ اور فروخت کر کے اپنا کام چلاؤ، چنانچہ وہ عرب آستانے کا تمام سامان لے گیا اور حضرت اُس کی اس بیباکی سے نہایت مسرور ہوئے۔

ہمدردی کسی کی مصیبت میں کام آنا اور کسی کے درد میں شریک ہونا، ہمدردی سے تعبیر کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں، اس کی مثالیں زمانۂ موجودہ میں تو درکنار صفحات تاریخ میں بھی کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔ دنیا کا نظام جس رشتۂ انتظام سے منتظم ہو سکتا ہے، وہ صرف ہمدردی ہے، اس مجاہدۂ نفس کے لیے، دنیا کی صدہا سوسائٹیاں کھڑی ہوئیں، کہیں، سیوا سمتی، کا آوازہ بلند ہوا اور کہیں حزب الاخلاص، کے نعرے لگائے گئے، کہیں گرلس گائیڈ کہیں اسکاوٹ سسٹم، اور کہیں آگ بجھانے والی پارٹیاں قایم کی گئیں، لیکن نتیجہ یہی نظر آیا کہ۔

بانٹ لے کوئی کسی کا درد یہ ممکن نہیں
بارِ غم دُنیا میں اُٹھواتے نہیں مزدور سے

سخن آرائیاں آسان ہیں، ڈینگ مارنا دلچسپ مشغلہ ہے لیکن ہمدردی مشکل ہے، اور جو ایک ہی طرح نہیں بلکہ ہزاروں اشکال میں ظہور پذیر ہوا کرتی ہے اور جس موقع پر جذبہ اخلاص میں تحریکِ عمل ہو، اُس کا نام ہمدردی ہے اس ہمہ گیر جذبہ سے صرف وہی ہستیاں پیراستہ ہوسکتی ہیں جو کسی روحانی مرتبہ پر فائز ہوں۔ اس درجہ پر پہونچکر حیوانات تک کی تکلیف کا تحمل نہیں ہوسکتا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کا ایک واقعہ ہے کہ کسی شخص نے بیدردی کے ساتھ ایک لاٹھی بھینس کے ماردی حضرت بایزیدؒ اس قدر متاثر ہوئے کہ تاب سکون بھی نہ لاسکے، چیخ اُٹھے کہ او ظالم رحم کر یہ کہا اور پیرہن کا پچھلا دامن اُٹھا کر بتایا، پشت مبارک پر لاٹھی کا نیلگون نشان اُبھر آیا تھا، اس یگانگت کا نتیجہ کلیتاً فنائے دوی ہے یا فنائے غیر ایسے ہی حالات میں جذبۂ ہمدردی انسان کے لیے سراپا احساس بنجاتا ہے۔ ہمارے حضرت اقدس میں اور اوصاف کے ساتھ ساتھ یہ ملکہ بھی ملکۂ راسخہ کی طرح نمایاں ہے،

ایک دفعہ ضمیر الدین ملازم سید ابن علی حاضر آستانہ ہوا، وہ اُس وقت ایک بوسیدہ اور شکستہ جوتا پہنے تھا، آپ نے اُس کا جوتہ جہاں، جہاں سے شکستہ ہوگیا تھا، باوجود اُس کے انتہائی روکنے کے درست فرمادیا۔

ایک دفعہ حضرت کیمپ سے آستانۂ مبارک واپس تشریف لارہے تھے راستہ میں ایک بھنگی نظر پڑا جو غلاظت کا ایک بھاری بوجھا اُٹھائے لئے جارہا تھا، بوجھ اس قدر وزنی تھا کہ اُس کی طاقت جواب دینے لگی، اور قریب تھا کہ وہ گر پڑے، آپ اُس کے پاس تشریف لے گئے اور دستِ اطہر سے بوجھا سنبھالنے میں اُس کی مدد کی، اور اُسے نہایت محبت و شفقت سے تسکین دی، یہ واقعہ ہمدردی کی ایک

ایسی مثال ہے جو ممدوح کی ذات گرامی کو ایک امتیازی شرف بخش رہا ہے۔ وہ بھنگی اور دیکھنے والے لوگ حیران رہ گئے۔ آستانے تشریف لاکر، غسل اور تبدیل لباس فرمایا اور دیر تک اُس بھنگی کی حالت پر تاسف فرماتے رہے۔

آپ فطرتاً بے حد رحمدل ہیں، یہاں تک کہ کسی کی تکلیف نہیں سُن سکتے، اگر کوئی شخص کبھی اپنی کسی مخصوص تکلیف کا تذکرہ کر دیتا ہے تو آپ کو سختی کے ساتھ اختلاج کا دورہ ہو جاتا ہے۔

سخاوت

یوں تو حضرت کی سخاوت کے صدہا واقعات زبان زد خاص و عام ہیں لیکن ہم یہاں اختصاراً چند واقعات پر اکتفا کرتے ہیں، جن سے آپ کے جذبہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

ایک دفعہ آپ کا مزاج کچھ ناساز تھا، اور اسی دوران علالت میں چار روز تک کوئی غذا تو درکنار چائے تک نہ ملی، ایک روز بہت ہمت کر کے دن بھر کی محنت میں ایک ٹوپی تیار کی جو دو روپیہ میں فروخت ہوئی، خادم آستانہ سے ارشاد فرمایا کہ ایک روپیہ میں کبوتروں اور بلیوں کے کھانے کا انتظام کرو اور ایک روپیہ میں میرے لیے، خرما، انجیر، چائے، قند وغیرہ لے آؤ، ہنوز خادم تعمیل حکم کے لیے روانہ بھی نہ ہوا تھا کہ ایک سائل آیا اور عرض کرنے لگا کہ آج صبح سے میں اور میرے بچے بھوکے ہیں۔ آپ نے خادم سے وہ دونو روپے لیکر اُس شخص کو دیدیے۔ سائل کے جانے کے بعد، ایک عقیدت مند نے دست بستہ عرض کیا کہ مجھے اجازت عطا فرمائی جائے تاکہ میں چائے کا سامان حاضر کروں، آپ نے مسکرا کر ارشاد فرمایا کہ آپ فکر نہ کیجیے آج سے میں اور میرے بال بچے خدا کے مہمان ہیں۔ اس واقعہ سے ارباب دل توکل اور استغنا کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اولوالعزمی کی معمولی سی مثال دیکھئے کہ جب نواب عبدالحفیظ خاں بہادر فردوس

آشیان، ولیعہد ریاست ٹونک حلقہ ادارت میں داخل ہوئے تو مرحوم نے ایک ہزار روپیہ نذرانہ پیش کیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ روپیہ غربا و مساکین میں تقسیم کردو، چنانچہ تعمیل ارشاد کی گئی۔

اسی طرح ایسی مثالیں بکثرت ہیں، جن سے سیکڑوں اشخاص واقف ہیں۔

قناعت

قناعت و توکل، صبر و بے نیازی، اپنے مفہوم کے لحاظ سے اسقدر قریب قریب ہیں کہ ان کا جدا جدا امتیاز، مشکل ہو گیا ہے، حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ ملکات ایک ہی سرچشمۂ اخلاق کی مختلف نہریں ہیں، جن کی موج خیزیاں صرف اُسی چشمہ کی فیاضی پر منحصر ہیں۔ ان ملکات میں سے اگر کسی ملکہ میں ذرا بھی انحطاط پیدا ہو جائے تو اس سلسبیل کا فیضان ناممکن ہے۔ ان ملکاتِ حمیدہ کی غایت یہی ہے کہ پیکرِ انسانیت کی تہذیب اور عروس باطن کی مکمل آرائش ہو، ہر صورت ملکات کا مقصد وحید جبکہ تزکیۂ باطن اور تکمیل انسانیت ہی ٹھیرا تو یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان ملکات کو ایک شیرازہ میں منضبط کیوں نہ رکھا گیا اور اس مجموعہ اخلاق کے اجزا کس لئے پراگندہ رکھے گئے، ان کا مقصد صرف تکمیل انسانیت اور تزکیۂ نفس ہے لیکن ہر ملکہ شریفہ سالک کو مختلف راستوں سے گزار کر منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے اس لیئے ہر ملکہ کو علیحدہ علیحدہ ایک ملکہ تسلیم کیا گیا تاکہ منازل تحصیل وطلب میں سالک کو کسی ترتیب سے اُن کا اصول تعلیم کے مطابق حاصل کرنا کسی حد تک آسان ہو، ورنہ حقیقتاً کسی درویش کامل کی انسانی آنکھ اس تقسیم لفظی کی نگاہوں سے نہیں دیکھتی۔

ہم حضرت اقدس کی قناعت پر جب غور کرتے ہیں تو بے ساختہ دل سے زبان پر آجاتا ہے۔

اللہ کرے اور یہ اوصاف زیادہ

ایک مرتبہ کسی صاحب ثروت نے کچھ اشرفیاں نذر کیں ارشاد ہوا کہ کسی حاجتمند

کو دیدو، کیونکہ مجھے احتیاج نہیں اس لئے میں ان کا مستحق نہیں۔

کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ حضور کا ذریعہ معاش کیا ہے فرمایا۔ مَنْ یتوکّل علی اللہ فہو حَسْبُہٗ۔

صبر رکن سلوک وطریقت اور صفات الٰہیہ میں سے ایک صفت حمیدہ ہے، منازل سلوک میں مکارہ وشدائد کا تحمل، تاویلات شیطانی پر عدم لغزش فوائد صبر واستقلال ہیں اور مصطلحات ارباب طریقت انہی کو صبر واستقلال سے تعبیر کرتے ہیں۔

نتائج صبر مرتب کرنے سے یہ مدعا ہے، کہ ہمارے حضرت میں یہ صفت مخصوص طور پر پائی جاتی ہے، چنانچہ اُس دور تاریک اور عالم بے کسی میں، جبکہ آپ کے والد ماجد نے رحلت فرمائی، آپ علایق دینوی قطع کرکے گوشہ نشین ہوگئے، اور انتہائے اعتصام واستحکام صبر واستقلال کی بدولت جو قدرتاً آپ کی فطرت میں ودیعت تھا، جملہ مراحل طے فرمالیے ۱۳۲۳ھ ہجری میں آپ کے ریاضت ومجاہدہ کی ابتدا ہوئی، اُس وقت حادثات کے تصادم اور سانحات کی یورش نے آپ کو یکسر رنج والم اور مجسمۂ مصائب وآلام بنا رکھا تھا، یعنی ابھی والد بزرگوار کی جدائی کا قلق تازہ ہی تھا کہ آپ کی مادر مشفقہ نے ۱۳۲۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

بہ اقتضائے فطرت انسانی یہ حوصلہ شکن صدمات ایسے تھے جو پائے ثبات کو ڈگمگا دیتے، لیکن آپ مستقل اور صابر رہے اور اپنے عزائم کو غیر متزلزل رکھا۔

نو عمری اور ماحول کی دلخراش صورتیں، پھر استقلال وثابت قدمی، ایک عدیم النظیر مثال اور سبق آموز واقعہ ہے۔ بارگاہ ایزدی کی طرف رجوع کی یہ حالت تھی کہ ہمہ تن محو ریاضت ومجاہدہ تھے۔

صبر کی تین قسمیں ہیں :-

(۱) جو مصیبت آئے اُسے سکون کے ساتھ برداشت کرنا اور زبان شکوہ نہ کھولنا، ایسے لوگ صابر کہلاتے ہیں۔

(۲) جو تکلیف ہو وہ برداشت کر کے خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے یہ مرتبہ شاکرین کا ہے۔

(۳) جو تکلیف پہونچے اُس سے لطف اٹھایا جائے یہ مرتبہ عارفین کا ہے۔

یہ درجہ کروروں انسانوں میں سے کسی ایک کو بھی مشکل سے حاصل ہوتا ہی۔

حضرت اقدس صبر کے یہ تمام مدارج طے کر چکے ہیں دکھ، درد اور بیماریوں نے سالہا سال سے آپ کو ہدف بنا رکھا ہے، اختلاج قلب اس حد تک پہونچ جاتا ہے کہ مونھ سے دھواں نکلنے لگتا ہی، ناخن ہرے پڑ جاتے ہیں، اور اکثر آپ بے ہوش ہو جاتے ہیں، لیکن جب ہوش آتا ہی تو وہی شکر خدا اور اس درجہ مسرور جیسے کوئی نعمت مل گئی۔

توکل توکل کے متعلق قابل بحث و تحیص تین چیزیں ہیں حقیقت و تعریف اور نتیجہ، یعنی علت غائی۔

توکل نفس کی اُس قوت کو کہتے ہیں جس کے اکتساب کے بعد انسان کو کسب دنیا کی ہوس، تمول و شہرت کی خواہش باقی نہ رہے۔ لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہی کہ توکل کو ترک اسباب کا مترادف سمجھا جاتا ہی، جو حقیقت کے خلاف اور واقعیت کے منافی ہی، دراصل توکل ترک اسباب اور ترک سعی کا نام نہیں، بلکہ نفس کے ملکات کو اس درجہ مجلا و مصفا کرنا کہ خواہشات و جذبات شہوانی سے تعلق اور لگاؤ باقی نہ رہے۔

گر توکل مے کنی در کار کن
کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

سے صاف تشریح ہوتا ہے کہ توکل حقیقی کے لیے کسب معیشت اور اکل حلال کی جد و جہد

اتنی ہی ضروری ہے جتنی لفظ کے لیے معنی اور جسم کے لیے روح، ورنہ اسباب کو ترک کر کے دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنا ننگ وجود ہے،

یہ تو توکل کی حقیقت اور تعریف ہے، اب رہی اس کی علت غائی اور غرض اصلی، تو توکل سے اعتماد علی اللہ کی صفت پیدا ہوتی ہے، دنیا اور عوارض دنیا کی حقارت کا جذبہ زیادہ ترقی کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے اور نفس کو سکون کلی اور توجہ الی اللہ کے مراتب کی جانب صعود کی توفیق عطا فرمائی جاتی ہے حقیقتاً توکل عالم فقر کے لیے ایک ضروری ملکہ ہے، اگر یہ پیدا نہ ہو تو سالک راہ طریقت میں" وَمَنْ یَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ" کے صحیح مفہوم پر اطمینان کے ساتھ عمل پیرا نہیں ہو سکتا، پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے، خالص توکل اختیار کیا جائے۔ ورنہ اگر ایک طرف انہماک دنیا میں پڑنے کا اندیشہ ہے تو دوسری جانب "لا رہبانیۃ فی الاسلام" کا ڈر لگا ہوا ہے۔ اکثر وہ دنیا دار اور سست فقیر جنہیں اکتساب معاش کے تمام شعبوں میں ناکامی کا مونہہ دیکھنا پڑا ہوا اور جو علم و ہنر کی رفعتوں پر نہ پہونچ سکنے کے باعث قوائے عملیہ کو معطل کر کے، محنت و کوشش کی عظمتوں کو فراموش کر چکے ہوں، توکل کی آڑ لیکر جاہل اور کم عقل انسانوں کو دہوکا دیا کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو متوکل کے باوقار اور سنجیدہ نام سے یاد کرنا، توکل کی توہین اور اُن اصول شرعیہ کی تذلیل ہے جو ہمیں امور دنیوی میں انہماک اور معاملات عالم کی کشاکش میں حصہ لینے کی تعلیم دیتے ہیں۔

خدا نے دنیا و مافیہا کو کیوں پیدا کیا، یہ ایک سوال ہے جو فطرتاً ہر حساس قلب اور ہر ذی فہم دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ کیا اس لیے کہ ہم ایک گوشہ میں بیٹھکر تماشا دیکھیں اور اپاہج لوگوں کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں اور قوائے دماغیہ کو مطلق معطل کر دیں، یقیناً نہ یہ قدرت کا منشا رہے اور نہ توکل اس بات کی اجازت دیتا

دیتا ہے، حقیقی متوکل وہی ہے جو معاملاتِ دُنیوی میں انہماک و مشغولی کے بعد حرص و ہوا کے مہلک اثرات سے بے لوث اور پاکیزہ رہے۔

ہمارے حضرت کا توکل حقیقی معنون میں توکل ہے، آپ بحمداللہ اکتساب معاش کے مروجہ ذرائع سے واقف ہونے کے باوجود راضی برضائے آلہ ہیں اور اپنے توکل صحیحہ سے درس اعتماد علی اللہ دے رہے ہیں۔

بے نیازی

بے نیازی نفس کا وہ ملکۂ شریفہ ہے جس کی تکمیل سے انسان صحیح معنون میں انسان بن سکتا ہے بے نیازی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی حاجات وضروریات میں اپنے ہمجنسوں سے استمداد کا طالب نہ ہو۔

حقیقتاً جتنا تعلق بے نیازی کو روحانیت سے ہے، اُس سے زیادہ ربط، اسے تہذیب نفس وعلم الاخلاق سے ہے، کیونکہ طبائع جبلتاً رفعت پسند اور فریفتۂ نمود واقع ہوئی ہیں، یہی احساس برتری اگر ترقی کے ساتھ لیکن شائبۂ تکبر سے خالی ہو، تو ہم اُسے بے نیازی سے تعبیر کریں گے۔ اگر بے نیازی کے ایک جانب خوشامد و دنائت کی مہلک اور تباہ کن گہرائیاں ہیں، تو دوسری طرف ذراسی لغزش میں، تکبر وغرور کے ہیبتناک غار موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ بے نیازی اور غرور میں تمیز اور اُن کے حدود کا تعین دشوار بلکہ دشوار تر ہو کر رہ گیا ہے۔ اصل یوں ہے کہ جس طرح بے نیازی کے لیے امارت و دولت کے مقابلہ میں اظہارِ استغنا ضروری ہے، اُسی کے دوش بدوش افلاس و احتیاج کے مقابلہ میں، تواضع اور ہمدردی بھی لازمی ہے، کیونکہ بے نیازی کا اصل منشا یہی ہے کہ امرا اور اہل دولت کے قلوب پر متمول کی بے حقیقتی، اور فقر کی عظمت و رفعت کا سکہ بٹھایا جائے"، اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے، جب ایک طرف کامل استغنا، اور دوسری طرف حقیقی تواضع وانکسار جلوہ نما ہو، ورنہ صرف اگر استغنا ہی استغنا ہوگا تو وہ تکبر و

غرور پر محمول کیا جائے گا اور حالات بھی اُس کی تقلید کریں گے۔

مذہبی اعتقاد کی رو سے، انا اللہ غنیٌ حمید کے ساتھ جب ہم "تخلقو باخلاق اللہ" پر غور کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ بے نیازی کے بغیر ہمارے امور مادّی اُتنے ہی ناقابل ثبوت اور غیر مکمل ہیں، جتنا جسم، رُوح کے بغیر، یا باغ، موسم بہار نہ ہونے سے

روحانیت اور باطنی لحاظ سے تو ظاہر ہے کہ بے نیازی جادۂ سلوک کی پہلی منزل ہے اور علم لدنی کا سب سے پہلا اصول زرّین۔

جب تک سالکِ راہ طریقت میں شان بے نیازی نہ ہو تو وہ حقیقی معنوں میں درویش کہلانے کا مستحق نہیں بن سکتا اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے حضرت اقدس میں، یہ شان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ ایک مرتبہ علیا حضرت فرمانروائے بھوپال نے بکمال عقیدت فرمایا کہ "حضرت کبھی میرے غریب خانہ پر بھی تشریف لاکر عزت افزائی فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں اس شرط پر کہ آپ پھر کبھی ایسی تکلیف نہ دیں۔ درویش کو نہ شاہانہ سطوت و جبروت کی پرواہ ہوتی نہ وہ دنیوی شرف و اقتدار کو خاطر میں لاتا"، وائے بر فقرا جو ہمیشہ رئیسوں اور امیروں کے در تک پہونچنے کی تدبیریں کرتے ہیں، اور پھر اپنے آپ کو درویش کہتے ہیں۔

شجاعت

شجاعت جذبات انسانی میں سے وہ جذبہ ہے، جو بالواسطہ صیانت حیات میں معین و مددگار رہی، عام لوگوں میں اس جذبہ کا وجود دنیوی معاملات سے متعلق ہوتا ہے۔ غیرت و حمیت جیسے جذبات شریفہ کی تکوین بھی اسی جذبہ کے تحت ہوتی ہے"، لیکن اہل اللہ کا جذبہ شجاعت، اخلاق رذیلہ، مکائد شیطانی اور نفسانی کمزوریوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے، کیونکہ انسان کی سب سے اہم شجاعت یہی ہے کہ وہ اپنے نفس پر فتح حاصل کرلے، اپنی

خواہشات، شہوانیات اور مطالبات نفسانی پر غلبہ پا جائے۔

اولیاء اللہ کی شجاعت کا منظر فسادات دُنیا میں نظر نہیں آسکتا، عارفان خدا کی شجاعت صرف ہوا و ہوس کے مغلوب کرنے اور نفس کے مقید کرنے میں نظر آتی ہے اور اسی کا نام جہاد اکبر ہے۔

ہمارے حضرت اقدس کے ضبط نفس کی مثال ذیل میں تحریر کرتے ہیں، جو تکمیل جذبۂ شجاعت پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔

سید ابن علی فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں حضرت میرے غریب خانہ پر جلوہ فرما تھے، ایک رات کوئی تین بجے ہونگے کہ مجھے آواز دی میں حجرۂ عبادت میں حاضر ہوا، آپ اُس وقت مصلّے پر کھڑے تھے، مجھے دیکھ کر اپنے پائے اقدس کی طرف اشارہ کیا میں نے دیکھا پاؤں سے خون جاری ہے، میں گھبرا گیا اور واقعہ پوچھا فرمایا سانپ نے کاٹ لیا ہے، اور میں نے اوسے پکڑ کر باوام والی برنی میں بند کردیا ہے، ایک دھجی پانی میں تر کرکے میری انگلی سے لپیٹ دو، جب میں تعمیل ارشاد کرچکا تو حضرت نے دوبارہ وضو کیا اور بدستور عبادت میں مشغول ہوگئے۔

میں فکر و تشویش میں صبح تک حجرے کے باہر بیٹھا رہا بار بار اُٹھتا تھا اور دروازے کی درازوں میں سے آپ کو دیکھ لیتا تھا، صبح کی نماز کے بعد میں چائے لیکر حاضر ہوا اور کیفیت مزاج پوچھی، ارشاد ہوا کہ الحمد للہ بالکل اچھا ہوں۔ چائے پینے کے بعد باہر تشریف لائے اور مجھے حکم دیا کہ سانپ کو لیجا کر آبادی سے کہیں دور چھوڑ دو۔

سانپ کا کاٹنا اور آپ کے اطمینان و سکون میں فرق نہ آنا راضی برضائے الٰہی کا تہتم بالشان ثبوت ہے، اور ایک دشمن جان کو بغیر انتقام آزاد کردینا نفس مطمئنہ کو درس کامل دینا ہے۔

خودداری

غرور و انکسار کے اُس مجموعے کا نام خودداری ہے جس میں ہر دو جذبات، اپنے ابتدائی اور انتہائی مدارج میں ایک دوسرے سے مخلوط ہو کر، ایک ایسا معیار قایم کر لیتے ہیں، جس کا کوئی پہلو مکارم اخلاق کے حدود متعارفہ سے متجاوز نہیں ہوتا، یہ وہ نازک و لطیف جذبہ ہے جسے خفیف سے خفیف لغزش بھی حدود معینہ سے باہر کر دیتی ہے یہ وصف اُسی حد تک وصف کہلانے کا مستحق ہے جب تک اس کا مفہوم اپنے وقار و وضع کو نمایاں رکھتا ہو ہستی یا روح تو ہر انسان کی بلا تفریق مذہب و ملت قابل احترام ہے، جس پر ارباب علم کی ایک بڑی جماعت متفق ہے، اس لیے کسی کا اپنی نفس ہستی کو قابل احترام سمجھنا عین احترام انسانیت ہے، یہ مرتبہ خودداری کا نہیں ہے، خودداری وہ جذبۂ شریف و خلق محمود ہے، جس کی تصویر پیکر وقار دکھاتا ہے اور وقار خود ایسا مجسمۂ عزت ہے جس کی ترجمانی کچھ زبان خموش ہی کرتی ہے،

سید الساداتؑ، امام المتقین سیدنا حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے تذکرۂ اخلاق حمیدہ میں فرزدق نے ایک شعر کہا ہے جو وقار کا زبردست فلسفہ دکھاتا ہے۔

یغضی حیاءً و یغضیٰ من مهابته

فلا یکلم الا حین یتبسم

"وہ بہ سبب حیائے فطری آنکھیں نیچی کئے رہتے ہیں اور لوگ اُن کی پر وقار ہیبت سے نگاہیں پست کئے رہتے ہیں اور جب تک وہ خود تبسم نہ فرمائیں لوگ اُن سے بات کرنے میں جھجکتے ہیں۔"

غرض یہ ہے کہ وقار (نہ کہ تکبر، انانیت اور غرور) آپ اپنی عزت کرنا ہے یا ضمیر (کانشنس) کی عزت کرنا، مکارم اخلاق سے ہے۔ اسی اصول پر خودداری کی بنیاد

ہی، لیکن یہ بھی انانیت کا مرادف نہیں ہے، اگرچہ بعض لوگ خودداری کا غلط مفہوم سمجھکر اُس سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، لیکن ہم کہہ چکے ہیں کہ حقیقت میں خودداری غرور اور انکسار کے متذکرۂ بالا مجموعے کا نام ہے۔ غرض اپنے ضمیر کی عزت کرنا اپنی خداداد عزت کی حفاظت کرنا، خودداری اور ایک جذبۂ پسندیدہ ہی، ہاں اپنی ذات کو بندگان خدا پر مقدم یا انھیں پست و ذلیل سمجھنا، ایک مذہبی گناہ اور ایک ناقابل تلافی اخلاقی جرم ہے، اور ایسا احساس ہے جسے صرف غرور ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہی۔

علم نفسیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہی کہ جب تک انسان اخلاق حمیدہ میں بدرجۂ اتم کامل نہ ہو، اُس وقت تک یہ جذبۂ لطیف پیدا نہیں ہو سکتا، اس وصف سے متصف ہونے کے لیے بلند خیالی، مستقل مزاجی، عالی حوصلگی، پختہ کاری، بے نیازی اور کامل درویشی کی ضرورت ہی۔

یہ وصف بھی انھی مرصعات سے ہے جن سے فطرت انسانی مزین ہی اور جو انسان کو روز ازل ہی سے عطا ہوا ہے۔ بدمعاملگی نفس یا دنائت طبعی اس حسن کے روبہ نقاب ہونے کا نام ہے، لیکن جس وقت مجاہدات و ریاضات سے انسان کمالِ انسانیت و تزکیۂ نفس حاصل کر لیتا ہی تو یہ حجابات خود بخود اُٹھ جاتے ہیں اور یہ فطری جوہر اُس کی ذات میں پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہو جاتا ہی۔ یہی وہ جذبہ ہی جس سے انسان مسلک عوام سے نکلکر منزل اصفیا پر فائز ہوتا، اور اپنی شخصیت کو کامیاب بناتا ہے، جس طرح حُسن اخلاق سے کمال درویشی پہچانا جاتا ہے، اسی طرح اس وصف سے درویش کی شانِ بے نیازی اور توکل پر کوئی نظریۂ راسخہ قائم کیا جا سکتا ہی۔ خودداری ایک ایسا جذبہ ہے جس کی پستی و بلندی، دو تو حالتیں اپنے اخلاقی مقاصد سے دور افتادہ اور دوسرے رذائل

انسانیت کے دوش بدوش ہیں، اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اس جوہر فطرت
کے ضائع کر دینے کا نام عین نفس کشی ہے، جیسا کہ ملامتیہ کا خیال ہے۔ اول تو فطرت
انسانی تبدیل نہیں ہوسکتی، اس کے علاوہ عقل سلیم بھی اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے
لئے تیار نہیں ہے، مانا کہ اصول، مقاصد کی تکمیل کے لیے رہنما ہیں، لیکن ضرورت
ہے کہ اپنے مقاصد کو تبدیل کرتے وقت ایسے اصول بنائیں یا تلاش کریں جو ہمارے
مقاصد کی تکمیل کے لیے آسانیاں بہم پہونچا سکیں احساس نفس کشی کا مقام اولین ہے
اس مقام کو طے کرنے کے بعد انسان اور مقاماتِ محمودہ، رضائے الٰہی بے نیازی،
اور توکل وغیرہ کی طرف ترقی کرتا ہے، یہ مسلم ہے کہ جس کام کا آغاز اچھا ہو اس
کا انجام بھی بہتر ہوتا ہے۔

جذبۂ خودداری، رضائے الٰہی، بے نیازی، اور توکل کے عمل و اتحاد باہمی
کا نتیجہ ہے اس لئے اس کا احترام ہر صورت میں جائز ہے۔

ہمارے حضرت میں یہ وصف اس مستقل سنجیدگی کے ساتھ موجود ہے جو آپ کی
شخصیت کو ایک ایسی ہستی تسلیم کراتا ہے جس کی عملی تقلید سے ہر انسان مرتبۂ کمالِ
انسانیت پر فائز ہوسکتا ہے۔

یہ کہنا بیجا نہیں کہ یہ جذبۂ حمیدہ ایک ایسا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے کہ جب تک
اس کی مثال میں کسی خوددار انسان کی زندگی کا مرقع پیش نہ کیا جائے، اس کا
حل ہونا دشوار ہے۔

اس کے لیے ہم اپنے حضرت اقدس کی "حیات"، اور آپ کا یہ قول، جس سے
خوددار زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے، پیش کرتے ہیں "انسان کی رفیع المرتبی
یہ ہے کہ ملائکہ بھی اس کے مرتبہ شناس نہیں، کسی مادی طاقت کے سامنے سر جھکانا
کیسا، وہ تو خود مسجود ملائک ہے"

اقوال و نصائح

ہر وہ ذات جو حکیمانہ اور فلسفیانہ دل و دماغ لیکر آتی ہے جس کا مقصد اصلاح نفوسِ عامہ اور جس کا منشا جمہور کی خرابیٔ علم و عمل کو دور کرنا ہوتا ہے، اکثر اپنے اعمالِ شبا روزی اور اقوالِ الہامی سے لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف لیجاتی ہے۔ وہ وجودِ گرامی جن سے اصلاحِ خلق جیسا کام متعلق ہوتا ہے اور جنھیں طبیبِ روحانی کہا جاتا ہے، ہدایت کے مختلف طریقوں سے کام لیکر، مخلوق کے باطنی امراض کا ازالہ کرکے، اوامر اور نواہی کے بتانے اور جتانے کے بعد وقتاً فوقتاً اپنے گرانمایہ اقوال سے اُن کے خفتہ ضمیروں کو بیدار کرتے رہتے ہیں۔

جس طرح قرآن حکیم نے اپنی شانِ نزول سے مختلف مواقع پر یہ ظاہر کر دیا کہ واقعی ہدایتِ خداوندی کی اُس موقع پر ضرورت تھی، اسی طرح اربابِ صفا اور صوفیائے کرام نے اپنے اقوال و نصائح سے خلقِ خدا کو اُن کے منافع اور مضارِ دینی و دنیوی سمجھا دیئے۔

انبیاءِ عظام و اولیائے کرام جن کی زندگی کا ہر پہلو کافۂ انام کے لیے درسِ روحانیت اور تعلیمِ انسانیت ہوتا ہے، اپنے زرّین نصائح سے لوگوں میں رُوحِ عمل پھونکدیتے ہیں، ان کے اعمال و افعال مخلوقِ خدا کے واسطے خیر و نیکی کا نمونہ ہوتے ہیں، وہ موقع بموقع اپنے اُن اقوال سے جو گنجینۂ ہدایت اور سرچشمۂ حکمت و موعظت ہوتے ہیں، مخلوقِ خدا کو قعرِ ضلالت و گمراہی سے نکالکر اُن کے دلوں کو اپنی دانش آموز باتوں سے معمور کر دیتے ہیں، چنانچہ ذیل کی سطور میں ہم حضرتِ اقدس کے وہ حکیمانہ اقوال اور وہ ہدایت آموز نصائح اختصاراً نقل کرتے ہیں جو سالکانِ منازلِ معرفت کے لیے مشعلِ راہ اور عامۃ الناس کے لیے سامانِ صد برکت

دینی و دنیوی ہیں۔

علم اصلاحِ عمل و دفع کسل کے لئے حاصل کرنا چاہئے نہ کہ بحث و جدل اور امورِ دینیہ میں خلل ڈالنے کے لیے۔

تمام سیر و سلوک کا ماحصل یہ ہے کہ دل گرفتاریٔ ماسوا اللہ سے آزاد اور خاطر حضور اور شہودِ حق سے آباد ہو۔

ادائے آدابِ عبودیت دلیل ہے قربِ الوہیت پر

رضائے حق تعالےٰ سے کوئی بہتر طلب نہیں۔

نفس کی مخالفت سے معاملاتِ روحانی میں تقویت ہوتی ہے اور نفس کی متابعت سے قوتِ روحانی میں ضعف پیدا ہوتا ہے۔

چاپلوسی اور زمانہ سازی ایک قسم کی انسانی کمزوری ہے اور صدق و راستی شعارِ انسانیت اور موجبِ اعتمادِ مرداں ہے۔

خاکسارانِ کوئے مسکنت و قناعت گزینانِ کنجِ فقر و فراغت ہرگز دنیا اور اہلِ دنیا کو خاطر میں نہیں لاتے۔

مرد وہ ہے جو ہر حال میں راضی برضا رہے۔

ہوا و ہوس کا طوفان قلب میں ظلمت پیدا کرتا ہے۔ اور حرص وطمع کا جوش سکون دلی کو پراگندہ کرتا ہے۔

بد باطن آدمی ہمیشہ لوگوں کے عیب تلاش کرتا ہے۔ اور پاک باطن انسان اپنے ہی عیوب پر نظر رکھتا ہے۔

تن پروری خود پرستی ہے جو حق پرستی سے باز رکھتی ہے۔

بزم عالم کی نزہتیں ظاہر بینوں کو آب و تاب دکھا کر اپنے رنگ روپ پر مائل کر لیتی ہیں لیکن اہل بصیرت کبھی ان نزہتوں کے دھوکے میں نہیں آتے۔

بے سروسامانی اور کم مائگی ایک نعمت ہے اور تونگری ایک آفت ہے۔ جس کو خدا چاہتا ہے نعمت عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے آفت میں ڈالتا ہے۔

جو تونگر اپنے کاروبار کی طرح اپنے قلب کی بھی نگرانی کرتا ہے اُسے تونگری کی آفت سے نجات ملتی ہے۔ یعنی وہ تونگری میں بھی سچی خوشی اور دلی شادمانی سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔

جو مسکین دنیا کی محبت میں مبتلا ہوا وہ تونگر سے زیادہ آفات کا شکار بنا۔

حد سے زیادہ دور اندیشی بھی ایک دیوانگی ہے۔

اختتام

اتمام کار کی وہ تمام لطف افزا کیفیتیں، مجھے انتہائی مسرور بنائے ہوئے ہیں جو ایک طرف تو قلب کو انوار سعادت سے منور، اور دوسری طرف تکمیل تمنا کی لذتوں سے روح کو بے خود بنا رہی ہیں۔

مسرتیں آج میرا حصہ ہیں، اس لیے کہ دنیا کے سامنے اُس مایۂ ناز ہستی کے حالات پیش کر رہا ہوں جس سے عالم اجسام کا ہر فرد، ہر قسم کے استفادات حاصل کر سکتا ہے۔

حضرت اقدس نے جن ریاضات وعبادات، جن مجاہدات ونفس کشی سے ذات اطہر کو سنوارا ہے، وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ایک عالم واقف ہے، اور اُن سب کا ایک مختصر سا حال آپ اس کتاب میں بھی پائیں گے، مقبول بارگاہ لم یزلی ہو جانا کوئی آسان امر نہیں، طاعت وبندگی ورضائے مولےٰ بہت مشکل ہے، لیکن وہ دل جو فطری استعداد اپنے ساتھ لاتے ہیں اور توفیق ربانی جن کے ہمراہ ہوتی ہے، ان صبر آزما اور حوصلہ شکن مواقع پر ثابت قدم اور مستقل رہتے ہیں۔

الحمدللہ کہ آج حضرت اقدس کی ذات مرجع خاص وعام بنی ہوئی ہے، اور ہر شخص اپنی طلب کے مطابق ضرور کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ تصرفات باطنیہ کا ظہور اکثر ایسے مواقع پر ہوتا ہے، جبکہ قلب ہمایوں پر ایک طرح کی تاثری کیفیت طاری ہو جائے۔

شب بیداری، کم سخنی، ذکر وفکر آپ کی وہ عادات راسخہ ہیں جو جزو حیات بن گئی ہیں، آپ کا موضوع کلام اکثر غوامض ونکاتِ تصوف کی تشریح اور تعلیمات

قرآنی کی توضیح ہوتا ہے، کبھی کبھی عالمِ جذب میں یا حالت کیف میں، زبان فیض ترجمان
سے بعض وہ مضامین نظم کا جامہ پہن لیتے ہیں، جن سے ایک عجیب قسم کی وجدانیت
مترشح ہوتی ہے، مثلاً

بہارِ لالہ و گل باعثِ تسکیں نہیں یا رب
کوئی جنت اُتر آئے نگاہِ شوق ساماں میں

صاف ظاہر ہے کہ یہ شعر ایک عارف باللہ ہی کہہ سکتا ہے مشتاق دیدار خداوندی
کے جذبۂ ذوق و شوق کو بہار لالہ و گل سے کیا تسکین ہو سکتی ہے۔ وہ تو اُن سرمدی
جلوؤں کو چاہتا ہے جو اُس کی نگاہ شوق ساماں میں جذب ہو کر رہ جائیں۔ دنیا کے یہ فانی
حسن اُس کے غیر فانی جذبات محبت کی تشنگی کو کیا بجھا سکتے ہیں۔

کبھی ہم بھی تھے بزم عشرتِ فردوس ساماں میں
کبھی یادش بخیر اپنا بھی چرچا تھا گلستاں میں

بزم عشرت فردوس ساماں کا کنایہ، ارباب ذوق و بصیرت کو، اُس محفل ازل
کی یاد دلاتا ہے۔ جس کو لسان الغیب، نے اس طرح کہا ہے۔

من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود
آدم آورد دریں دیر خراب آبادم

بہرحال حضرت اقدس کی ذات، ان صفات سے بالاتر ہے وصف شاعری ایک
دنیا دار کے لیے باعثِ کمال ہو سکتا ہے لیکن ایک عارف کامل کے اوصاف میں کوئی
اضافہ نہیں کر سکتا، انچہ فخر تست آن ننگ من است، جو بیش بہا اسلامی خدمات
آپ نے انجام دی ہیں، اُس کا صلہ کسی دُنیوی ہستی سے ممکن نہیں، بلکہ صرف اللہ
جل جلالہٗ آپ کو عطا فرمائے گا۔

میں اپنی تمام عقیدت کیشیوں اور بہترین دعاؤں کے ساتھ، اس تذکرہ کو ختم کرتا ہوں اور بہ ہزار خشوع وخضوع بارگاہ ایزدی میں ملتجی ہوں کہ یہ برگزیدہ ہستی، یہ مقدس ذات، یہ مُصلح خلق وجود، جب تک دنیا میں اسلام ہی اور جب تک اسلام میں حقانیت و صداقت ہے اور جب تک حقانیت و صداقت اوصاف خداوندی ہیں، اُمت مرحومہ کی رشد و ہدایت کے لیے قایم و دایم رہے۔

این دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

خادم۔ اقبال

:- اشفاق محمد کے اہتمام سے علیگڈھ پرنٹنگ ورکس علیگڈھ میں چھپا۔